گلشنِ ہند

مشہور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

مرزا علی متخلّص بہ لطف

نے، بعہد مارکوئس آف ویلزلی گورنر جنرل ہند، اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلگرسٹ کی فرمائش سے، علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے، مع اضافوں کے اُردو زبان میں، جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے،

سنہ ۱۸۰۱ء

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ء

میں

شمس العلما مولوی شبلی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے

کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا

اور

دار الاشاعت پنجاب

کے

رفاہِ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

ڈیڈی کیشن

ہزایکسیلنسی مہاراجہ یمین السلطنۃ

بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کو چوں کہ

اُردو زبان سے ایک خاص دلچسپی

ہے، اور آپ خود بھی اُردو زبان کے

ایک ممتاز مصنّف اور بلند پایہ شاعر

ہیں، لہذا یہ کتاب جناب کے نام

نامی پر ڈیڈکیٹ کی جاتی ہے

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

خاکسار

عبد اللہ خاں حیدر آباد دکن

فہرست تذکرۂ گلشنِ ہند

پبلشر کی التماس

۱۳۲۶ھ ہجری کے موسم برسات میں پائے تخت حیدرآباد کی مشہور ندی میں، جو ہمارے شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منجمد زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اَور ہزاروں چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا؛ اور اُس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آوردہ کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں، اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما، مولوی غلام محمد صاحب، مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجۂ غایت پسند کیا، اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا، لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرز عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اُس کے شائع کرنے کی رائے دی اَور خود اُس کے اِڈِٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اُس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہٖ چھاپ دیئے گئے ہیں +

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں، اور تاریخی حیثیت سے اُس کی اہمیت، اُس مقدمے سے ظاہر ہو گی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے، پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمایش سے اس تذکرے پر لکھا ہے جس میں اُنہوں نے اُردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ اور اُس کی قدیم تصانیف کا بیان اَور تذکرہ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبد الحق صاحب کو ریویو لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے، اُس کو تمام اُردو داں پبلک جانتی ہے، کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریئے کے اَور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے +

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے اپنی علمی فیاضی سے، یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی۔ علامہ شبلی بھی خاص شکریئے کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اپنی عنایت سے اُس کی تصحیح، اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا +

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور حتّی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے، البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونۂ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اُس میں سے صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اَور کوئی تصرف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اُس کو اَور زیادہ مخزن معلومات بنایا گیا ہے۔ جس کی قدردانی کی پبلک سے اُمید کی جاتی ہے۔ اگر پبلک نے اس کی قدردانی کی تو ہم بہت جلد اَور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہوسکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں +

عبداللہ خاں

کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد دکن

۱۶ ر نومبر ۱۹۰۶ء

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشنِ ہند

(از مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن۔)

یہ کتاب شعرائے اردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت[1] شخص کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو جو انھوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا +

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیس ٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی ابراہیم[2] خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی

---

[1] مولوی عبداللہ خان صاحب کتبخانہ آصفیہ حیدرآباد دکن ۱۲

[2] علی ابراہیم خاں، متخلص بہ خلیل، مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے، اور بعد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف مجسٹریٹ اور بعد ازاں گورنر رہے، اور سنہ ۱۲ ہجری میں دہیں انتقال کیا ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔

(۱) گلزار ابراہیم، تذکرۂ شعرائے اردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیس ٹنگز کی گورنر جنرلی میں، ۱۱۹۸ھ (۱۷۸۴ء) میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی +

(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں +

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس سنہ ۱۲۰۱ ہجری میں لکھی گئی۔ اس میں سنہ ۱۱۶۷ھ سے ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں بیجر فریزر نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں، اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لے کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی +

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، اگرچہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ فقرہ لکھا ہے کہ "من کہ علی ابراہیم خاں یکے از خیر خواہان کمپنی انگریزم" لہذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے +

(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اور جس سے اس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے +

میں لکھا تھا۔ اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں ۱۱۹۸ھ ہجری مطابق ۱۷۸۴ء عیسوی میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انھوں نے مؤلف تذکرۂ ہذا سے فرمایش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور اُن میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے +

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بےبسی اور بےکسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچّہ بچّہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ ادھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنھوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں نے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں ہنسوڑا اور تو ہے مقطع میرا ٹیڑا امیل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو اچھی طرح نباہ دیا،

ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہہ دی، کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا؛ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقررہ ہیں، اور اب تک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیوں کہ ہمارے نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے استاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے)، سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اردو کو وسعت ہو تو کیوں کر؟

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے۔ اس نے اردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔ اس لئے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا، جس کا ابتدائی اور اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی

تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دربار و دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے۔ اور مختلف کتابیں لکھوانا شروع کیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اُردو نثر پر کیا ہے +

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا اس کی نگرانی میں، یا اَور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا +

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے ۱۸۰۱ء عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرایش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گلِ مغفرت یا وہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اُردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اَور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے +

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحرالبیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اُردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اَور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب

ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں ۔

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ دُرانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے۔ یہاں سے سنہ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۱-۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور انیسویں صدی کے آغاز میں دلی کی جو زبان تھی اس کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نو طرز مرصع رکھا تھا۔ میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابو الفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا، اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے ۔

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہجہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ اُن کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے، مسٹر گلگرسٹ کے مشورے سے، زباں دانانِ ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چناں چہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے

ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سجان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی ۱۸۰۵ء میں سعدی کی گلستاں کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے ۱۸۰۰ء میں کلکتہ نئے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انہوں نے ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے، اور جو ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان وحیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، و لطایف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے۔ اور ریز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلگرسٹ نے ۱۸۰۱ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے، اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلگرسٹ سے اول بھی

ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی، جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ وہ بالکل ناکافی تھی، جنرل ولیم کرک پیاٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے انہوں نے تین حصے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہونے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ لئے ہیں جو عربی فارسی سے ہندی میں آ گئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری ٹائپ کا انتظار تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلگرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چوں کہ ان کو اَور بہت سے کام کرنے تھے، اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے، اور ڈاکٹر گلگرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۶ء میں چھاپ دیا، مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ستّر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔ حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت حسرت کے ساتھ خیر باد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ و کمانڈنٹ ملٹری ایکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۸ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی

برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برایس کی لغت سنہ ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اُردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش کی۔

میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:-

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زباں دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتہ سے لکھنؤ "گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے مجہول "کے محمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں "سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتہ میں شاعری کی جا درخواست حالی ہے"۔

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اُردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ:-

"انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اُردو میں نظم کیا، اور نام اس کا اسرار محبت رکھا"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ:-

"انہوں نے میر محمد حسین - فرنگی لقب "کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہشتین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی اعانت سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائیڈ سابق ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اُردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلہ تعلیم کے لئے عُمدہ عُمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کار آمد صلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عُمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں شمس العلما مولٰنا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائیڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُردو نثر کی طرح اُردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر رل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اُردو کی صدارت قبول فرما کر اُردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے، اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اُردو کتابیں بھی انہوں ہی نے چھپوائیں، اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اُردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ، اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لیتھو گراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں، استعمال ہوا۔

اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی +

وہ انگریز حاکم، جس نے اُس ملک میں بیٹھ کر جو اُردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اُسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب و غریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص فرقے یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈفادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار ہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قایم رہے گی +

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے، دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے، بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور نا کافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے +

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، ۱۱۵۲ھ ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے، اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں +

"میرا ارادہ سیر حیدرآباد کا تھا مگر چوں کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس

"تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہذا میں نے اسے بسر و چشم قبول کیا"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں، عہد سلطنت قایم ہے، اُسی بادشاہ روشن

دل خدا پرست سے ..... "

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے، اور بعد ازاں مارکوئیس آف ولزلی کا ذکر کر کے لکھتے ہیں :۔

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس

ہیچدان نے یہ تذکرہ لکھا"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا۔ اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی ۔

"حیراں پھریں ہیں بے سر و پا بہمن اور دے"

"تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے"

۱۲ - ۱۲۲۷ = ۱۲۱۵ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے ۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدر آباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے، اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدر آباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے، یا اہل حیدر آباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس تعلق کو بڑی خوبی

۵۷ ڈاکٹر جان گلگرسٹ ۱۲

سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں:۔

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے"
"دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ اُنہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواست کرتے ہیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں:۔

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا
سو دو سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

"شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر در پہ خوار و زار

"ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں
لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار

"اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے، اے امیرِ فلک قدر و کے تبار!

"سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

"ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل و نہار

"بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

"خلقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

"باقی جو سو رہے، کئی دن میں زباں پہ پھر
مثلِ مجردات فقط ان کا ہے شمار

"تجھ سا ہو قدر دانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیرِ پنجۂ چرخِ ستم شعار

"فضل و ہنر جو مجھ میں سب ہے وہ سب یک طرف
اور قدر دانیاں بھی تری سب یہ یک کنار

"ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آیندہ اختیار

"ازبس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافے کا ہوں گا اُمیدوار

"لیکن نہ وہ اضافہ جو ہووے برائے نام
کر ہوں سو پچاس میں گر ہو کشود کار

"تصنیف اصل چاہتا ہی تجھ سے یہ ضعیف	کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار	
"غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں سیر تین سو	چھ سو جب اُمیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار	

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آرہی ہے، اور اب تک باقی ہے۔

اس قصیدے میں شاعر نے تعلی کی لی ہے، اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کی مدح میں اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر۔

"اے شان حیدری ز جبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کارِ ذوالفقار"

امیر الامراء نے زر و سیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے:۔

"غیر لفظِ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار"
"آئینِ قدر دانی ہیں لیکن برائے نام لازم یہی ہے کر گیا جو خانِ باوقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے:۔

"کہتی ہے فارسی میں مجھ طبع مطلعے ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار
"اے ذرہ ہا ز نامِ تو خورشید اعتبار تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا۔

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے،

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہی تجھ سے کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
"توجہ اتنی فرما تو کہ یا محتاج کی رو سے نہ ہوں محتاج عندالوقت سیم و زر و گوہر کا

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:۔

"میرزا لطف کچھ دنوں نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں :-

"اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں۔ البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اُردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ ایک انگریز با اقتدار کی فرمائش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اَور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے، اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے، کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں، اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں، اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :-

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر پھنا کرکے، تھے"

اسی طرح میر قمر الدین منت کے حال میں لکھا ہے :-

"چنانچہ شکرستاں 'کرکے' ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں، سوز نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے۔

"ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا — رہے گا مرگ کے 'بعد از' مزار میں رونا"

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات بالکل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں۔ مثلاً :۔ فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ منیا کے حال میں لکھا ہے:۔

"دلی سے جبکہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا وہیں ٹھیرے"

فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں :۔

"بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے"

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قایم کہتے ہیں :۔

"میں کہا" عہد کیا کیا تھا رات،

"ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اُردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مولف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی، اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً :۔ رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے معشرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز بے خیال کا، اور جادو طرازی

"میاں بین معانی پرواز بے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے"۔

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"جب میر صاحب لکھنؤ گئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کر دیا، مگر چوں کہ بد مزاج انتہا درجے کے تھے

نواب سے بگاڑ کر لیا، اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"۔

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ:-

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں

ناظر کے سپرد کر دیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی

قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ہجری ہیں، وہی حال

ہے جو اوپر مذکور ہوا"۔

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نان شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ھ ہجری میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جان نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے۔ اور اخیر میں کورنمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے، اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کر دی ہے، جس میں یہ واقعہ منظوم ہے، اور خود اُردو نظم میں ترجمہ کر کے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اردو کا ہے، اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے۔ البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تاناشاہ، آصف الدولہ اور

مرزا محمد رضا اُمید کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا اُمید کے تذکرے میں، امیرالامرا حسین علی خاں، اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔
۴۔ چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے، اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ، نواب اور امرا اس طرف جھکے، تو وہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انہیں اَور کھو دیا۔ مُلک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہو گئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہو گیا تھا، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی، شعر شاعری نے اس کا سامان اَور مہیا کر دیا، دیوانہ را ہوئے بس است، شاعروں کی بن آئی، وہ تو اس شغل میں رہے، اور یہاں کام تمام ہو گیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے، اس کے خاص خاص آداب تھے، بڑے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے، اور تھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے، جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی، کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے، شاگرد ہو گئے، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہو گی؟

علاوہ اس عام حالت کے، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے، تب بھی شاہان دہلی اور ان کے

گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنو چلے آئے تھے:۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے
"کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازپروری کے کہ کبھی پیادہ قدم کا ہے کو
"چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک الایچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ مجرا گاہ پر سے جاکر آداب بجالاتے تھے"

۵- پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جن کی نسبت اُردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اُردو کے شاعر تھے، اور اُن کا تخلص اشتیاق تھا۔ یا عبدالقادر بیدل بھی اُردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اُردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور رہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ایک موقعہ پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ ہوا تھا، چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے
"قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے
"یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"۔

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ، جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو لکھنو کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا۔

" زبس کو فہ سے یہ شہر ہم عدد ہے ۔۔۔ اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے "

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے۔ درحقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔

خواجہ میر درد کے بھائی، میاں سید محمد میر اثر، کی مثنوی خواب و خیال اب تک سُنی ہی سنی تھی، اس کے

چند شعراء اثر کے حالات میں درج ہیں شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلۂ ذیل نوٹ لکھا ہے[۱]، جو کتاب کے صفحہ ۴۳ پر درج ہے :-

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنو کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعراء لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے"۔

ہمیں تعجب ہے، کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بیحد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ "لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف وثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر وانیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے، حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو ونما اور اُس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے، تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے، اور اس میں دلی لکھنو والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام، (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا، اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آرہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس کی

---

[۱] شمس العلما مولوی شبلی نے ازراہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے نا سمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولٰنا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کُھل جائے حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولٰنا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ اُنھوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہدیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفٰی خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے:۔

"مثنوی ایشان شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است، وازیں جہت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آبِ حیات میں کہتے ہیں کہ:۔

"ایک مثنوی خواب وخیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شُستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے، اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا سراپا کا مضمون اس قدر مُبتذل ہے، کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت اور بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے، کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے، یعنی:۔

اثر | ہاتھا پائی میں ہانپتے جانا | کھلتے جانے میں ڈھانپتے جاتا

شوق   ناتھا پانی میں ہاں پنتے جانا   چھوٹے کپڑوں کو دُعا پنتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں"۔

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہئیے کہ وہ مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولانا حالی نے صاف لکھ دیا ہے:۔

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"۔

اخیر اس میں تو ظاہرا ایک حد تک کچھ گنجایش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولانا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالا چک بست صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے۔ تعجب ہے، کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں، سیکڑوں لفظی اور معنوی غلطیوں سے پر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں، موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں، جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے، مثلاً: شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں"۔

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہہ کر "یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے" خوب ہجو ملیح کی ہے، اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں اور ناکاروں کے ناکار۔ بقول شاعر کے۔

"شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزوں ہے بھونا ہیں کتے کی بلی کا آگی موجود ہے"

یا مظہر جانِ جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :۔

"۱۱۹۴ ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسایل صدیقی نے، اور اس معتقد پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینۂ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا"۔

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ :۔

"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مقام ہے"

مکہ مسجد کا کھدوانا زا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے، کہ مولف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں، کہ مکہ مسجد موجود ہے، اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں، ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا بیستی کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے۔

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لائق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رُتبہ نام کا نہ پایا"۔

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ :۔

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے ہا لڑتی ہے"۔

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے، کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلایق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دہانی، کبھی سلاطین

اسلام کا دار الخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بہ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا، کبھی معرکۂ جنگ وجدل وقتل عام ہے، اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے، کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال سب ہے، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے، کبھی مورد بلیات و آفات ہے، اور کبھی منزل حسنات و برکات، غرض یہ نگری یوہیں اجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی، مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن اخیر زمانے میں، جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو دو ایک جھٹکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال ہو گیا سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ درانی کی چڑھائی ہوئی، پھر مرہٹوں نے وہ ادھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا، اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت مصنف تذکرہ لکھتے ہیں

"جس ایام میں معمورہ شاہجہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت وعذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صاحب زاویہ گزین نے اور ہر ایک تونگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے ادھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار، کہ نام نامی اس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب لے دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا: آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو اٹھا وہیں پہنچا، اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خان آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے، سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے سنہ ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کو کوچ فرمایا

میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہوگئی، اور میر حسن میر سوز جرأت، سب لکھنؤ ہیں جا بسے، اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہ امر کہ لکھنؤ کی سوسائٹی کا اُردو زبان اور اُردو شاعری پر کیا اثر ہوا تفصیل سے ہماری بحث سے خارج ہے

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خان کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوگی، اور کم سے کم اُس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے اخیر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۱۵ ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۱۵ تک میر انشاء اللہ خاں میرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اُسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیوں کہ میرزا سلیمان شکوہ اسی سال (۱۲۱۵ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سُنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۱۵ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے ۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے:-

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب وقار، کے حالات لکھے گئے ہیں، دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا۔"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں ۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اُس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے۔ صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحہ کے صفحے رنگ دیئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے ۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا، اور جو لوگ اُردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائینگے ۔

عبد الحق بی۔ اے (پرنسپل مدرسۂ آصفیہ)
حیدرآباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی، دلبرانِ سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی، نازفروشان ناطقہ کو اُس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے، جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظ عربی اور فارسی کی آرائش کے ساتھ خرامِ ناز سکھایا۔

ثنا اور حمد ہے اُس ذوالمنن کو
یہ بخشی جس نے رنگینی سخن کو
چمن[1] کے ہم نے معنی کی جو لی باس
تو ہر گل کی نئی بُو ہے نئی باس

سرسبزی اور شادابی، چمنِ بیان نے اُس بہارِ گلشنِ [illegible] کی نعت سے پائی، جس کی آبیاریِ فیضِ عام کے باعث خارِ خارِ نظمِ دلخراش اُردو کا رشکِ رگِ گل ہے۔ تر و تازگی اور سبزی گلبنِ معانی کو اُس رونقِ گلزارِ رسالت کی توصیف نے عطا فرمائی، جس کی نسیمِ نعت کی موج زنی سے ہر فقرۂ پریشان نظمِ ریختہ کا حسرتِ سنبل ہے۔ **قطعہ**

رحمۃٌ للعالمیں جب سے سنی ہے اُس کی ذات
گرمیِ خورشیدِ محشر سے نہیں کچھ بیم ہے
گو ہمارے جرم ہم کو آتشِ نمرود ہوں
وہ شفیع اپنا ہے، تو گلزارِ ابراہیم ہے

[1] اس مصرع میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے "معنی کے چمن کی جو ہم نے باس لی"، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا۔

آبداری تیغ زباں کو اُس جوہرِ شمشیرِ شجاعت کی منقبت نے بخشی ہے، جس کی سیفِ دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعۂ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار[1] کا۔ اور وسعت میدانِ سخن طرازی کو اُس شہسوارِ عرصۂ یکہ تازی کی تعریف نے عطا کی ہے، جس کی کشت گلگوں کی تحریر سے کیفیتِ خامہ کرتا ہے صفحہ کاغذ کو تختہ گلزار کا

ہے گلستانِ ولایت کا وہ باب	تذکرے کا علمِ دیں کے انتخاب
لفظ و معنی مصرعِ آئیں کا ہے	مطلعِ دلکش بیاضِ دیں کا ہے
مدِّ بسم اللہ سرلوحِ نجات	شاہ بیتِ کلّیاتِ کائنات
اور فرزند اُس کے عالی دودماں	تاجنابِ حضرتِ صاحب زماں
آلِ پیغمبر اور اصحابِ کرام	ہو نزولِ رحمت اُن پر اور سلام

بعد حمد اور صلوٰۃ کے، رنگ دینے والوں کو چمن بیان کے معلوم ہووے، کہ شاہ گیتی افروز روشن ضمیر، شاہ عالم بادشاہ غازی کی بادشاہت میں، اور شمعِ شبستانِ دولت و اقبال وزیرِ اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں، اور رونقِ بزم انصاف وعدالت نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن[2] ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں، علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اُس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے سنہ ۱۱۹۸ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سرحلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفلِ معانی، سخن کی جان، اور سخن دانوں کی قدردان، صاحب والامناقب، مسٹر گلکرسٹ[3] صاحب کی نظر مبارک سے گذرا

---

[1] یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا ۱۲

[2] اس عہد ہندوستان کے گورنر جنرل، دلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے، اور اس کو فخریہ تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے ۱۲

[3] یہ وہی گلگرسٹ صاحب ہیں جن کے ایما سے میر امن صاحب نے چار درویش لکھی۔ درحقیقت اُردو زبان کا رفارمر یہی شخص ہے ۱۲

ازبس کہ شاعروں کا احوال اُس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال
اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے، تو خوب ہو، اور ہر ایک
شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے، تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے
بڑا مزا پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اُٹھائینگے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی وجلی، میرزا علی کو، کہ **لطف** تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و
اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن دہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں"۔
اگرچہ یہ پابند اُلفت کا اس ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خُلق مجسّم کے
اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا، کہ مجھ سے سوائے
اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سرِ مو آپ کے فرمانے
سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحر حلال ہے، جن لوگوں کا یہ آئین ہے اُن کا
خوشا حال ہے۔ غرض مدعائے دلی اُس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا، کہ ان فارسی کتابوں کے
ہندی نثر کرنے سے مراد ہیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم اُن
کی تربیت کے لئے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں، تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت
آوے، اور اُن کی طبیعت اُس سے بخوبی مزا اُٹھاوے[1]۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت
میں لفظ عربی اگر آوے، تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ"۔ اور لفظ فارسی جگہ پاوے،
تو ویسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ"۔ اُمید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر
سرانجام اور مقبولِ نگاہِ خاص و عام ہو۔

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی

---

[1] اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہلِ قلم، سادہ اُردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے مصنف
صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلّت گوارا کی ۱۲

کے ہیں، عہدِ سلطنت قایم ہے ایسے بادشاہ روشن دل خداپرست سے، جس کی چشمِ حقیقت بیں کے سامنے دلقِ گدائی اور خلعتِ شاہی برابر ہے، اور نظرِ معرفت اثر کے روبرو مساوی کلاہِ فقیر اور تاجِ اسکندر ہے۔ تخت نشینِ بارگاہِ سرفرازی، **شاہ عالم بادشاہ غازی**، قایم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہِ بے آزار کو، اور زیادہ کرے اُس کی قدرت اور اقتدار کو۔ اور بالفعل مسندِ وزارت کو زیب اور زینت اُس رونق بخشِ بزمِ عیش و کامرانی سے ہے جس کی محفلِ عیش و نشاط کی غیرت سے تعجب نہیں ہے کہ زہرہ غرقِ عرقِ پشیمانی میں ہو، اور مشتری مانند آئینہ کے گرفتارِ بندِ حیرانی میں۔ ساغرنوشِ خمخانۂ دولت و اقبال، مخمورِ بادۂ جاہ و جلال، یمین الدولہ ناظم الملک **سعادت علی خاں** بہادر مبارز جنگ، ساقیِ روزگار جامِ اُمید کو اُس کے شرابِ مراد سے چھلکتا رکھے اور اس ایامِ فرخندہ فرجام میں محفلِ حکومت اور ایالت اُس امیرِ صاحبِ تدبیر سے رونق پذیر ہے، جس کی بہارِ گلشنِ عدالت میں تحقیقات ہے چاکِ گریبانِ گل کی[1] اور پرسش ہے نالۂ دلخراشِ بلبل کی، کہ گل کا گریبان کیوں چاک ہے؟ اور بلبل کی آواز کیوں دردناک ہے؟ سوسن کی زبان بندی سو سو بار ہوتی ہے، اور نرگس کے احوال کی تلاش ہے کہ راتوں کو کیوں نہیں سوتی ہے؟ اس زبان واری پر کیا باعث ہے سوسن کی بے زبانی کا؟ اس چشمِ خماری پر کیا موجب ہے نرگس کی حیرانی کا؟ قمری کے طوقِ گردن کی جست وجو ہے، اور صدا اُس کی "جو کو کو" ہے، اُس میں گفتگو ہے، کہ کسی چیز کا اس کی گم ہونا ثابت ہوتا ہے لفظ "کو کو" کی تکرار سے، گلا اس کا باندھا گیا کس تقصیر کے اقرار سے، غنچہ کی گٹھری کو نسیم بے اجازتِ بہار کے کھولے، تو صاحبِ تقصیر ہے، اور زرِ نقد کو گل کے خزاں ہنسی سے بھی ٹٹولے، تو واجب التعذیر ہے۔

سبحان اللہ عدل اور انصاف ویسا کہ جس کا مشکل بیان ہے عقل اور فراست ایسی کہ جس

---

[1] یعنی گریبانِ گل کی چاک کی تحقیقات ہے ۱۲

میں قاصر زبان ہے ارسطو کو سامنے تقریر کے دعویٰ طفل دبستانی کا، اور افلاطوں کو روبرو تحریر کے اظہار ہیچمدانی کا۔ یہاں تک تو اُس کی قدردانی سے اب علم کا رواج ہے، کہ مملکت جہل جاہلوں کے ہاتھوں سے ہوتی جاتی تاراج ہے معمار حکم نے اُس کے وہ مدرسۂ عالی شان بنا کیا ہے، جس کے بام عرش مقام کی پہلی سیڑھی اگر ساتویں آسمان کو کہئے تو بجا ہے۔ کرسی شاہ نشین کی گھمنڈ عرش نشانی کا رکھتی ہے۔ نسبت اس کو بیت الشرف آفتاب سے کیونکر دی جا سکتی ہے۔ صفائی کو دیوار کی دیکھ کر فقط آئینہ ہی حیرت سے نہیں پشت بر دیوار ہے، بلکہ شرمندگی سے پانی پانی گوہر آبدار ہے۔ تعریف سے اُس امیر عالی منزلت کی عہدہ برآ ہونا مجال نہیں ہے زبان کی، اور توصیف سے اُس والا مرتبت کی نکتہ سرا ہونا طاقت نہیں ہے بیان کی۔ شہسوار معرکۂ دشمن ستیزی، سرحلقۂ گروہ خردپژوہ انگریزی، زبدۂ نوابانِ عظیم الشان، مشیر خاص حضور فیض معمور بادشاہ کیوان بارگاہ انگلستان، اشرف الاشراف مارکویس ولزلی، گورنر جنرل بہادر ناظم ممالک محروسۂ سرکار کمپنی انگریز بہادر، و میر اعظم عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقہ کشور ہند، فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی۔ عہد دولت میں اس عالی جناب کے ازبسکہ آرام ادر چین ہر ایک شخص کے نصیب ہے، اور عز و وقار اہل علم کے قریب ہے، موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس کا، بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے، **گلشن ہند** رکھا۔

اگرچہ احتیاج تاریخ کے نظم کرنے کی نہ تھی، کس واسطے کہ نثر میں سنہ ہجری اور عیسوی دونوں کی کیفیت لکھی ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاید یہی سمجھ کر گلزار ابراہیم میں تاریخ نظم سے چشم پوشی کی ہے، لیکن یہ نہ چاہئے، کیونکہ بہ نسبت نثر کے نظم پر ہر ایک شخص کان دھرتا ہے، اور حافظہ اس کو بہت جلد قبول کرتا ہے، تعجب کیا ہے کہ اس کا اشتہار ہو، اور اہل سخن کی زبان پر اس کی تکرار ہو، تو جس کو سنی سنائی بھی یہ تاریخ یاد ہو گی، اس کو بن دیکھے اس تذکرہ کے معلوم اس کی بنیاد ہو گی۔ بارہا صفات کے اشتہار سے ذات کو شہرت ہوئی ہے۔ اس فائدہ کے واسطے تاریخ

نظم اس کی اس طور پر لکھی گئی ہے۔ **قطعہ**

ہر ایک گل ہمیشہ بہار، اس حدیقہ کا
کہتا ہے یوں خزاں سے کہ "تو کیا پشت ہے"

حیراں پھریں ہیں بے سروپا سمن اور دے،
تاریخ اس کی جب سے کہ "رشک بہشت" ہے
۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے، کہ اس نخلبند حدیقۂ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصّدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اوّل یہ جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی، اور گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی، اور خوش استعدادیاں اُمرائے عالی مقدار کی، اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور اور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے گم نام وغیرہ مشہور، یا وہ نومشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔ توفیق اس کتاب کی تمامی میں اُس مرجع کُل سے چاہتا ہوں، کہ جس کی طرف رجوع ہے جزو کُل کی۔ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ۔

باب الف

۱۔ آفتاب

آفتاب تخلص، نور نیّر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدفِ سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عمادالملک کے خوف سے دلّی سے نکلے، اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں، کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، منتظرِ عنایت الٰہی کے ہو کر ٹھیرے۔ اس میں بعد ایک مدت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الٰہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا، مشہور سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خان مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا کے، اور وسیلہ عزم کا ٹھیرا کے، آپ مع

فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، اور الہ آباد سے کوچ کر کے قریب عظیم آباد کے آپڑے
اب آگے رام نرائن، عظیم آباد کے نائب نظامت، کا بے حواس ہو کر محمد قلی خاں کی معرفت
حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چند مدت قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہو کر
لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور ہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بعد ایک چند روز کے شہرۂ جعفر علی خاں
اور میرن کی آمد آمد کا، واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے
مشرق کی طرف سے، ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ
میں نہ پا کے، پیش ازاں کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا، اور شاہزادہ عالی تبار
عالی گوہر نے، کرم ناسی کی ندیؔ سے، کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کر کے تھوڑی دُور
گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا، کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں
کے بھائی نے، کہ رفیق عماد الملک کا تھا، حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی
کہ "ایک فقیر بہت بڑا صاحب کمال فیروز شاہ کے کوٹلہ میں آکے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات
اس سے کرنی ضرور ہے"۔ حضرت بیچارے اجل گرفتہ، حکم میں تو عماد الملک کے تھے ہی، اپنے
پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے گئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خونخوار جفا کار، بے
شرم اور بے رحم اُس حجرے میں بٹھا رکھے تھے، جاتے ہی اس بے گناہ کو بیش قبضوں سے
مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کر دیا۔ شاہزادے نے سُنتے ہی اس خبر کے، گھوٹولے میں
پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندانِ بابریہ کے ۱۱۷۳ھ گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب مع "شاہ عالم"
کے ساتھ تختِ سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اور قلمدانِ وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ
کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیر الامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے،

---

۵۱ یعنی اس ندّی سے جس کا نام کرم ناسا ہے

نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیرالدولہ نے اُسی وقت موافق ارشاد کے ایلچی گری کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں پانچ چھ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہوکر، اقرار جانفشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات ضروری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا، کچھ کچھ رُپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ میرن کے آنے سے آگے ہی رام نرائن سے لڑ لیجئے، اور خدا فضل کرے، تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجئے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا، اور اُسی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن کے لشکر کے، کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آپڑے۔ اور بعد کئی دن کے میدان جنگ آراستہ کرکے کمال جانفشانی اور سرفروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت بہادری سے رام نرائن کی فوج میں در آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھرّوں کی مار کا، اور مدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا، بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدہا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہ شرمندگی سے پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے نشان[1] کے ہاتھی کا منہ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا" فرمایا "کیا ہوا، ہاتھی پھرا، اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا" یہ کہ کے دونوں بھائیوں نے کود کے گھوڑوں سے ایک تین سو جوانوں سے، کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جانبازی کی کہ ساری زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کر دی، خاطرخواہ دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہوّر کا حق ادا کرکے، دونوں بھائیوں نے مع رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی باقی نہ رہی جلادت گفتار کی۔

---

[1] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا ۱۲

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، ازبسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلے کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔

رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاکری صاحب سے کہلا بھیجا کہ "آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے" کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصے کئے، اور آدھے آدمی ادھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہیئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا، اور کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں انہوں نے مار لیا، لیکن اس مدبر نے زخمی ہو کر حوضی میں لیٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچارے گئے۔ مرلی دھر مع رحم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہراول فوج کے تھے، کامگار خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ احمد خاں قریشی اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا، بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے +

مختصر یہ کہ آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ۴۲ ہے، وہ اورنگ نشین بارگاہِ جاہ و جلال تختِ سلطنت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے +

سنہ تیسویں میں عہد سلطنت کے، منظور علی خاں ناظر کی بے بصیری سے شیخ غلام قادر خاں

زہیلے نے جو کورنمکی کی ہے مفصل بیان اس کا غضب ہے، اور نہایت ترک ادب ہے۔ لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے، کہ اور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا۔ ازبسکہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشیۂ پر کتاب کے لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے نظم

حادثے کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو ۔ دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

غزل

صرصرِ حادثہ برخاست پئے خواریِ ما ۔ داد برباد سر و برگ جہان داریِ ما
آفتابِ فلکِ رفعتِ شاہی بودیم ۔ بُرد در شامِ زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد ۔ تا نہ بینم کہ کند غیر جہان داریِ ما
داد افغان بچہ شوکتِ شاہی بر باد ۔ کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما
بود جانکاہ زر و مالِ جہان ہمچوں مرض ۔ دفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدیم ۔ ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما
کردہ سی۳۰ سال نظارت کہ مراد اد بباد ۔ زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما
عہد و پیماں بہ میاں داد و نمودند دغا ۔ مخلصاں خوب نمودند وفاداریِ ما
شیر دادم افعی بچہ را پروردم ۔ عاقبت گشت مجوّز بہ گرفتاریِ ما
حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم ۔ کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما
قومِ مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند ۔ بسکہ گشتند مجوّز بہ گرفتاریِ ما
ایں گدازادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برو ۔ بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریِ ما
گل محمد کہ زمرداں بہ شرارت کم نیست ۔ چہ قدر کرد وکالت پئے آزاریِ ما
نامراد و سلیمان و بدل بیگ لعیں ۔ ہر سہ بستند کمر بہر گرفتاریِ ما

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب
شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو

آنکھیں نکلیں، تو ہوا خوب کہ دیکھوں گا نہ میں
غیر کے قبضے میں اور نگ جہانداری کو

مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانکاہ
گردشِ چرخ نے کھویا مری بیماری کو

کی اس افغان بچے نے شوکتِ شاہی برباد
کون پہنچے گا خدا چھٹ[1] مری اب یاری کو

جو کئے تھے گنہ اُن سب کی سزا دیکھی ہیں
شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو

جو تھا تیس برس سے مرے گھر کا ناظر
پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو

بے گناہی نے مری اُس ستم ایجاد کئے ہیں
جلد پہنچایا مکافاتِ ستمگاری کو

حق طفلاں جو ہوا تیس برس میں تھا جمع
مار کر لے گئے یاں چھوڑ سبک باری[2] کو

قومِ افغان و مغل سب نے مجھے بازی دی
رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو

عہد و پیمان کئے اس ہیں، بھلا حقِ نمک
ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو

تھا جس افغان بچے کو دودھ پلا کر پالا
بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو

نازنیں میری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں
جز مبارک محل اس میری پرستاری کو

آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز
کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے ہاتھ
ہوگی بے رونقی اس طرز جفاکاری کو

ایضاً منہ

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من
زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بندِ من ست
ہست مصروفِ تلافیِ ستمگاریِ ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند
چہ عجب گر بنمایند مددگاریِ ما

راجہ و راؤ زمیندار امیر و چہ فقیر
حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواریِ ما

نازنینانِ پری چہرہ کہ ہمدم بودند
نیست جز محل مبارک بہ پرستاریِ ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم
باز فردا دہد ایزد سر سرداریِ ما

[1] یعنی سوائے خدا کے ۱۲ [2] یعنی یہاں صرف سبکساری اور نہیدستی چھوڑ گئے ۱۲

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے، اَے نظام
شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو

شاید آ نکلے محبت سے خبر داری کو
دور کیا ہے جو کرے دور دل آزاری کو

راجہ و راو زمیندار امیر اور فقیر
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سر و پا

چاہیئے سمجھے سعادت میری غمخواری کو
بخشنے کا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے، اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں +

کیجیئے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا۔
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکا
خون ہووے گا گالوں کا دیکھا ہر گز صبا
زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا
کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ

ہم تو بندے اُس کے ہوں، وہ یار ہوا غیار کا
ہوجیو یارب بھلا اس چشمِ آتشبار کا
کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا
نام مت لینا چمن میں اُس بت خونخوار کا
جاننا ہیگا سعادت باندھنا زنار کا۔
یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا
کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا
ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا۔

صبح اُٹھ جام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

ولہ

شب دل آرام سے گذرتی ہے
اب تو آرام سے گذرتی ہے

۲۔ آصف

آصف تخلص، نور کوکب ہمت اور شجاعت کا، خورشید آسمانِ مروت اور سخاوت

کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب شجاع الدولہ مغفور کا ہے، اور پوتا نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ کے کہ گیارہ سو ستاسی ۱۱۸۷ ہجری تھے، اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں، کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے، مسند وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ ازبسکہ رسم کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور وہاں مقر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب و رنگ گلشنِ وزارت نے بنگلے سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ کے تنِ بے جان میں گویا جان آئی، اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر کے عرصہ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزارہا آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خواہش شکار کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ ان کی کھالوں کے متعدد خیمے عالی شان بنوائے۔ پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے اور ارنے کو تھا پیغام اجل کا، اور بڑے دانت ہوئے ہاتھی کے بس یہی اس کے واسطے تھا دام اجل کا، مثل پر فیلِ مست کی جب اس کا تیر بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی دنتیلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارت عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں

لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمتگذاری کی، اور پانچ لاکھ روپے خرچ کر کے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے کچھ لے گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہو کر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں تھی ٹھیرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی" غرض جو کچھ چاہیے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا۔ چھبیس [۲۶] برس گل اس مربع نشین مسند وزارت نے حکمرانی کی، اور چمن گیتی میں مانند گل خورشید کے محتاجوں پر زر فشانی کی۔ آخر الامر از بسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریباں ہیں، بیماری سے استسقی کی سنہ ۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں، کہ سلطنت کو شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے، حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑ کر کار فرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغر سن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا، اور افراط عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مورد امتیاز تھا۔ اس شمع شبستان وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخن طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے۔ **قطعہ**

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا	اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز	خلق کا[1] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتش غم سے	دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سال تاریخ کا خیال کیسے	خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

[1] یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ۱۲

بولے یوں دور کرکے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا ۱۲ ۱۲

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں +

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے / ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح / ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم / سنیو اک دن کہ جسم وجاں سے گئے
عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے / نام سے گذرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا / "اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ "سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے"

دل ہمارا خانۂ اللہ کر مشہور تھا / ولہ / سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا
آباد ملکِ دل وہ یارو کہاں رہے گا / ولہ / جس جا یہ درد و غم کا نت کارواں رہیگا
آصف نہ چھپے عشقِ بتاں دل سے ہمارے / ولہ / سو بار اگر پھر بھی بناویں اسے گھڑ کر
شوخیِ چشم کی شہرت کو تری سن سن کر / ولہ / شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو / ولہ / یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے / یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے / ولہ / آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانئے
پوچھتے کیا ہو شبِ ہجر کی حالت یارو / ولہ / میں ہوں، اور رات ہے، اور بسترِ تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دستِ سخاوت کو زینہار / ولہ / لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے
یاں تلک داغِ محبت دل نے کھائے ہیں کہ بس / ولہ / سر سے پا تک ایک گویا صورتِ طاؤس ہے
ہزاروں مرے جیتے دیکھے تیرے بات کرنے سے / ولہ / لبِ معجز بیاں میں تیرے شاید آبِ حیواں ہے

۳- انجام

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام، والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہد سلطنت میں زینت بخش مسند امارت کے تھے۔ سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میران نعمت الٰہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت اور ناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عز و وقار کے، اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس و جلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے۔ اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآ رہی تھی، کہ رشک تھا اس پر سب ارکان دولت کو، اور اعیان مملکت کو، حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردش چشم کے سمجھنے میں زمانے کے اُستاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد ناز و انداز کی تہ داریوں کے اور اختراع کرنے والے جنون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور ناوبید کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کرلیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی اِن کی جہاں پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی لیکن موافقت و راندازی سے بدگویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبار خاطر ہوئی، اور خواہان جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی۔ چنانچہ ۱۱۶۹ سنہ گیارہ سو انہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انہیں کے عین صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا، کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری کے بجھا دیا، اگرچہ اس نااہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا۔ لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر ارباب فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا ہے اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم

فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی، اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھلی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزہ گوش صغار و کبار ہیں۔

کیوں بلایا مجھے میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو

دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی
دوستداروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
"کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی"

ولہ

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
منہ ترا تکتے ہیں سب اہلِ تسلیم حسن و عشق کے
دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا

مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم
عمر مانندِ شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ مکنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

۴۔ اُمید

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدنِ کمالات کا مرزا محمد رضا ہے، رہنے والا اصفہان کا، ایام شباب میں وطن سے غربت اختیار کرکے وارد اصفہان کا ہوا ہے، اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا، نسبت شاگردی کی درست کرکے کسب کمالوں کا کیا ہے۔ آخر سلطنت میں خلد مکاں[۱] کے ہندوستان میں آیا، اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ

[۱] یعنی اورنگ زیب عالمگیر ۱۲

کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبہ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے، اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزون بھی کیا ہے[۵۱]

مثل بلبل کے ہوں سدا نالاں   یہ مرا منصب ہزاری ہے

محمد معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور کو گیا، اور صوبہ داری میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا +

اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیر الامرائی کا، اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا، بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہوگا جب کہ سنہ ۱۱۳۲ گیارہ سو بتیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معز الدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے، مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بہادر خاں کے بیٹے کو، مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے بلا جو کیا، تو زنجیر سے توپخانے کے گھوڑوں کو کدا کدا کے مقابل ذو الفقار خاں کے، کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور کود کود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہئے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہو گئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے، اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے۔ اتنے زخم اُٹھائے، بارے سادات کے سر لڑانے سے پانوں طرف ثانی کے اُٹھ گئے۔ جو مرے سو موئے، اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معز الدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔

---

[۵۱] مثل بلبل ہمیشہ نالانم + ایں بود منصب ہزاری ما +

سید عبد اللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر، فوج کا تعاقب کیئے چلے گئے ہیں، اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبد اللہ خاں کو وزیر اعظم کیا، اور قطب الملک یار وفادار سید عبد اللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا، اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں، اور جو نمک حلالیاں کہ انہوں نے کیں ہیں مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے، اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی سے دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے، غضب تو یہ ہے کہ اس عقل مجسم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامل مان لئے پھر تو دشمنوں نے تدبیر ان کے توڑنے کی یہ ٹھہرائی، کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی، اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت کو نہیں تھی سواری گئی، کہ ساری دلی پکارتی تھی ”جگ پھوٹا اور رزد ماری گئی“۔ قصہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا تو ایک فوج عالی شان لے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا، کیونکہ فرمان بادشاہی معرفت خان دوراں خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیہ میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے قصور ہوگا، تو گنہگار حضور کا ہے۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے، کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جان بخشی کروائی ہے، اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا۔

چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں، گیارھویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی، بساط ہستی کی گنوائی، اور امیر الامرا فیروز جنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہوکر مسند حکومت کی آرایش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آتے ہی اہل خدمت برہان پور کے سب تغیر کئے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہوکر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا، اور مزاج دانی میں اُمرا کے بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی، اور داروغگی حکومت کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا، اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصّہ مشہور ہے، اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی، کہ ناظم حیدر آباد کا تھا، اختیار کی ✦

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے، کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے، لڑائی ہوئی، تو قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صید داجل کا نخچیر ہوا، اور قزلباش خاں دام ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں، اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی، اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی، اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری منی مرک کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا جو ندی ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چند مدت اس معدن معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت

آب و تاب سے بسر کی، اور اسی عرصہ میں رخصت حج و زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت زیارت کے جو آیا، تو نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ سنہ ۱۱۵۰ گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے، اور شاہ جہان آباد آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے مامور ہوئے، اور قزلباش خاں اس سفر میں فقط پاس رفاقت کرکے جدا ولی سے مجبور ہوئے۔

میر غلام علی آزاد تخلص، سرو آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں، کہ جس ایام میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازم حج کا تھا۔ اس قافلے کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔ باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور فہم درست رکھتا تھا، اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ "ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں بیٹے نواب اسد خاں، وزیر جو تھے، اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ "سچ ہے دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں۔" میں نے عرض کی کہ "اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں، کہ میرا تخلص "اُمید" ہے۔" غرض جب نواب آصف جاہ بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں، اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایام میں لڑائی کا طول دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دارو مدار کے مصلحتاً صلح کی، اور مع قزلباش خاں کے داخل شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا، اور دلی کا لوٹے جانا، مشہور ہے، یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا، اور شہر میں امن و امان ہوا، تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے، اور قزلباش خاں نوکری

چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلی کی محبت کے مارے چند روز اَور بھی ساتھ عیش و نشاط کے دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر ۱۱۵۹ھ گیارہ سو انسٹھ ہجری میں سکتے کی بیماری سے لاچار کیا سفر ملک عدم کا۔ تقریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے، اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے۔ یہ اشعار اُس ستودہ اطوار کے ہیں +

یا نازِ حور و حُسنِ ملک، جلوۂ پری۔
رفتم بہ پیش و گفتم "جانم فدائے تست"
ایسی نہ سیتا، اور نہ بھوانی نہ رادھکا
گفتم کہ "تیرے پانوں پڑوں اور بلا لیوں"

باہمن کی بیٹی ایک مری آنکھ میں گھڑی[۵۱]
(برہمن)
غصّہ کیا، دگالی دیا، اور دگر لڑی
(یعنی پھر)
کرتار[۵۲] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتا کہ "ڈاڑھی[۵۳] جار مُغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم "اُمیدِ وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ "چل پرے دئی مارے تجھے مری"

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
دل ہمارا اسے کرتا ہے رات
دردِ دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
دہر میں پاسِ نفس لازم ہے

ولہ

در و دیوار سے اب صحبت ہے
غیبت سے جو ہر شب صحبت ہے
ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار
آج اُمید کو ڈھب[۵۴] صحبت ہے

[۵۱] اور تذکروں میں گھڑی کی بجائے "پڑی" ہے جو "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲
[۵۲] کرتار یعنی خدا ۱۲
[۵۳] یعنی ریش سوختہ ۱۲
[۵۴] یعنی کڈھب ۱۲

۵- آرزو

آرزو تخلص ہے، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبرآباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیر الدین کے، کہ چراغ دہلوی جنکا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فرید الدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا، اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہیئے تھا اُٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہو کر وطن سے دور رہا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی گوالیر کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا، سنہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو تیس ہجری تھی کہ دارالخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زور شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہان آباد میں تشریف لائے، تو اُس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی، اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھیرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کر کے ایک رسالہ لکھا ہے، اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[۱]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم

---

[۱] مولوی امام بخش صہبائیؔ نے ایک رسالہ قولِ فیصل عام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دیئے ہیں ۱۲

ہوتی ہے، جیب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشتاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سر رشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خرابی کے شاہجہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے بیرنگی ہی کے رنگ دکھائے چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے، اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے، نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہجہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں:۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اس کا "موہبتِ عظمیٰ"[۱] ہے۔ اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیۂ کبریٰ" ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے، کہ نام اُس کا "سراج اللغت" ہے، بطور برہان قاطع کے۔ اور سوائے اس کے حال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے، کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کر کے۔ شرحِ اسکندرنامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے۔ اور گلستاں کی شرح، کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[۲] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسہ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں ◆

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے		زاہد نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے	
جان کچھ تجھ پر اعتماد نہیں	ولہ	زندگانی کا کیا بھروسا ہے	

[۱] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [۲] اس تذکرے کا نام مجمع النفائس ہے ۱۲

ولہ

آتا ہے صبح اُٹھ کے تیری برابری کو — کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک — کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیاگری کو
اس تندخو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے — ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے — بادِ صبا یہ کہنا اس دل ربا پری کو
اب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے
اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

ولہ

فلک نے رنج تیرِ آہ سے میرے زبس کھینچا — لبوں تک دل سے شب نالے کو میں نے نیم رس کھینچا
مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو — بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا
رہا جوش بہار اس فصل گر یوں ہی تو بلبل نے — چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا
کہا یوں صاحبِ محمل نے سُن کر سوزِ مجنوں کا — "تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا
نزاکت رشتۂ اُلفت کی دیکھو سانس دشمن کی
خبردار آرزو تک گرم گرتا نفس کھینچا

۶ - آبرو

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد۔ اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب میں۔ اور صاحب دیوان تھے زبان ریختہ کے۔ ترکیب میں بیشتر اشعار اُنہوں نے ایہام کے کہے ہیں، یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں، کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں، اگرچہ بامعنی یا لایعنی۔ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سلطنت میں اُنہوں نے جہان فانی سے رحلت کی ہے۔ ان شعروں نے آبروان کے دیوان کو دی ہے +

خوبرویوں کے ہوا حق میں یہ تپ کرنا دوا — تیرگی جاتی رہی چیچک کی اور ابھی صفا

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن
تو گلے کس کے لگی لیکن کسی بے رحم نے
آہِ سرد اور چشمِ تر عاشق کی سے وسواس کر
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ
ترش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر

عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
بد بہت ہے مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
تو طفیلِ حضرتِ عاشق تجھے ہووے شفا
اور کھانا جو کہ ہو خوش کا تری[۵۱] سو کر غذا

بو علی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا، کہہ کے پھر گیا	وله	پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اُس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[۵۲] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم سنی	وله	کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور ہے آب رواں اور ابر ہے گھرا	وله	دوانا نہیں[۵۳] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا
چوپڑ[۵۴] کے کھیلنے کا سارا یہ ہے خلاصہ	وله	شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاس آ۔
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگائے		یا دام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو		کیا شوق کو ہمارے جاتا ہے اور کاسا
جھپٹ آیا میں رقیبوں کو گویا ماردیا	وله	یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
سنے کوئی[۵۵] اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا	وله	چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات جا کہنا	وله	کہ جانے سے تمہارے جان کو مشکل ہے اب رہنا

۵۱ "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا"۔ "خشکہ" کا ایہام بھی مقصود ہے ۱۲ ۵۲ "دیکھو" کو "دِکھو" پڑھنا چاہئے، ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا ۱۲ ۵۳ "نہیں" کو "نِہ" کے لہجہ میں پڑھنا چاہئے ۱۲ ۵۴ یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے: ۵۵ قدما "کوئی" کو "کُئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے، یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہئے ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے — وله — کہ اس کو بد نما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا

بیچ اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا — وله — زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا

جو لونڈا[1] نام سن امرد پرستی کا چڑھے چونکے — وله — میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں جوں لاسا

عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا — وله — وہ مرا دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا

جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا — وله — جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آ جا

فرہاد کا دل کوہ کوے کا بھرا پیالا ہوا — وله — مستی سے جس کی شوق کی ہر سنگ متوالا ہوا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی — وله — اس دلِ بے قرار کی صورت

زندگی ہے سراب کی سی طرح — وله — باؤ بندی حباب کی سی طرح

کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو — مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح

آبرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر — وله — خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر

جس وقت زخم تیر لگتا ہے غیر کے تئیں — وله — اُس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان مرہم

دھمکاؤتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر — وله — کھولے ابھی تو جاوے میاں کا نکل بھرم

کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو — وله — نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو

کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن — وله — جو اور سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں

ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں — وله — ہر چند سعی کر کر یاقوت و لعل مر جائیں

اک عرض سب سے چھپ کر کرنی ہے ہم کو تم سے — راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آ کے کر جائیں

لٹک چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اب تک — وله — طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

زلف کے عقدے کھلے اب اور بھی مشکل ہوئی — وله — دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی

میاں[2] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے — وله — کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے

دل کب آوارگی کو بھولا ہے — خاک گر ہو گیا بگولا ہے

---

۱ اس شعر سے اس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۱۲ ۲ یہی شعر بہ ادنیٰ تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے ۱۲

پھرتے تھی پھرتے وشت دیوانے کدھر گئے	ولہ	وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
مژگاں تو تیز تر ہے ولیکن جگر کہاں		ترکش تو ہیں بھرے یہ نشانے کدھر گئے
نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو	ولہ	موسیٰ کم نہیں تو فرعون کر رکھا ہے
اُٹھ چیت کہوں جنوں ستی خاطر نچنت کی یعنی ہوشیار ہو	ولہ	اے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

۷-احسن

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے - ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے - بعد اس کے میرزا محمد رفیع السودا سے مشورۂ سخن کا کیا ہے ریختہ ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے - فی الجملہ غربت بھی رکھتے ہیں، اور نستعلیق وغیرہ اکثر اکثر خطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں - ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سررشتہ ملازمت کا رکھتے تھے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہے، ایک مدت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں - لکھنؤ میں بود و باش ہے - اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے +

ہجر میں کیوں گریہ ہووے آہ و زاری بیشتر	ہے قرار اس دل میں کم اور بیقراری بیشتر
کیوں تفکر دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے	یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
پیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی	اب تو بتلا دے ہے تلوار و کٹاری بیشتر
روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم	وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اُٹھوں
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہ حزیں ہے	کوئی دم ہے یاں، سو دم واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا	ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے		نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے
قدم رکھے نہ اپنا مرے دل سے باہر		کہا مان میرا، یہ گھر دل نشیں ہے

نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا	ولہ	رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا
سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک	ولہ	پہنچا دیا ٹھوکر میں وہیں ملک عدم تک
سجدہ گہ ہے خاک احسن اب تو سارے خلق کی	ولہ	جان دی تھی اُس نے کس کی حسرت پابوس میں
دل ہو دیدا سے مایوس تو مسرور نہ ہو	ولہ	چشم میں روشنیِ طور سے بھی نور نہ ہو
بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی		دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو
ہے مجھ میں رمق، دیدہ تجھے تا نگراں ہے	ولہ	جیوں شمع مرا تار نگہ رشتۂ جاں ہے
محرم ہم ہوں، محرم اسرار ہو کوئی	ولہ	خلوت میں ہو کوئی، پسِ دیوار ہو کوئی
راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے		دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی
پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی	ولہ	سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی
تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے		بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۸-الہام

الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں۔ صغر سن ہے، دیکھتا ہوں ان کو، اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں، اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزود ہے، یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جا چکتا کہ دوسرا موجود ہے۔ اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے، لیکن اس زود گوئی کے باعث سے اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ دو دیوان فارسی زبان میں

رکھتے ہیں، اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے، اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنؤ کو، شاگردی کے سوائے، ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرارِ دل کا دکھاتی ہے ✦

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم	آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم
اے ابر مژہ ناصحوں کی ضد سے تو یکبار	سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم
یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جاوے	دکھلاؤں اگر چشم کے خونناب کا عالم
گل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے	پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم

مانی تراوا للہ[1] ہو بندا
کھینچے تو اگر دل کے تپ و تاب کا عالم

اری بیکسی تیرے قربان ہوں	ولہ	برے وقت میں ایک تو رہ گئی

۹-اثر

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہ جہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر دردِ مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے، اور آگاہ تھے علمِ معرفت سے۔ بطورِ درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی، اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی سے اپنے اُنہوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیانِ عشق میں ان کی تصنیف سے ہے، اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے ✦

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا		آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا
میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ	ولہ	پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

[1] اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑ دی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ۱۲

ولہ
بس ہو یارب یہ امتحاں کہیں / یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں / میں کہیں، اور کاروان کہیں

ولہ
بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں / تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس / دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہئے سو باندھئے بات / میں نے دانستہ کچھ کہا ہی نہیں

ولہ
تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں / پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے، سو کہاں؟ / اپنے باہر تو یہاں گذر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے / بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

ولہ
کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ ہیں / ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ ہیں

ولہ
ہم ہیں بیدل، دل اپنے پاس نہیں / آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے / مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر / مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

ولہ
میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں / کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں

ولہ
جو سزا دیجے، ہے بجا، مجھ کو / تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ولہ
ایک تنہا خاطرِ محزوں، جسے آزار سو / ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو

کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے	ولہ	اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے
بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی		ترے یہ طور، اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے

اثر کیجئے کیا، کدھر جائیے	ولہ	مگر آپ ہی سے گذر جائیے
کبھو دوستی اور کبھو دشمنی		تری کون سی بات پر جائیے
صرفِ غم ہم نے زندگانی کی	ولہ	واہ کیا خوب زندگانی کی!
ناک تیری عجب سجیلی ہے	ولہ	پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے
ناک ہے، یا کہ ایک توتا ہے	ولہ	چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
نتھنے ایسے ترے پھڑکتے ہیں		جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں		شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں		دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں		لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں
گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے		مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے		رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے
جب خیال آبندے ہے گردن کا		یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا
گو کہ شفاف ہے تنِ مینا		یہاں تو جھلکتی ہے گردنِ مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور		جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب[۵] وہ بازو آتے ہیں		ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

کیا خوش آبندیہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

[۵] مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے ۱۲

۱۰- الم

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہ جہان آبادی۔ خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے۔ درویش صاحبِ حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں۔ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور دوستی سے راجہ دولہ رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، شاہ جہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں:

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر
بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر

ہنگامِ فغاں تھا خس و پنبہ قفس و دام
تا رگِ گُل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر

جب نامِ خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو
مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر

مندیل کا تو پیچ اُٹھا بیٹھے گا اے شیخ
چھٹ اس کے نہ کچھ پاؤ گے رندوں سے جھگڑ کر

آجاتا ہے دُکھ درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے مزا تم ہو اُٹھاتے بھلا لڑ کر

رباعی

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب
نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب

واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو
جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۱۱- اشتیاق

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو جدِ ان کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا بخصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت

بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پر آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کر کے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں، چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسنین" ہے، اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"[۱] کہتے ہیں تصنیفات سے اس محی الدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشور قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدمِ توکل گاڑے ہوئے شاہ جہان آباد میں بیٹھے ہیں، باوصفیکہ تفضل حسین خاں مرحوم نے موجب ایما صاحبانِ عالی شان کے مدرسہ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکز دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطبِ آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اس کا "تحفۂ اثنیٰ عشریہ" ہے، اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں سچ تو یہ ہے دیکھے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے، کہ کیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقعہ کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہی ہوتے ہیں، اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے ؎

شیر کے بچے میں عرش شیر سے افزود ہے	بھونک میں کتے کی پلی کی سگی موجود ہے[۲]

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروز شاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں ؎

---

[۱] دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

[۲] شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب، دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے، اور اس شعر نے تو صاف پردہ اٹھا دیا ہے ۱۲

خیال دل کو ہے اُس گل سے آشنائی کا	نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا
کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ	ڈروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا
مجھے تو ڈھوٹا[1] کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج	غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا
جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام	بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا
نہ چھوڑا مار بھی کھا کر گذر گلی کا تری	رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا
نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی	غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہہ سائی کا

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اُسکو چوٹ	ولہ	پر ایک کر دیا ہے یہ مجنون کو دھول کوٹ
چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی	ولہ	نہیں مہندی یہ ترے تلوٗں سے ہے آگ لگی
دو بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے	ولہ	پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

۱۲۔ انشا

انشا تخلص، امیر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں اُنہوں نے نظم کی ہیں، اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گذشتہ اُنہوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط، یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کالپی بھجوایا، اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت

[1] یعنی طعنہ دیتا تھا ۱۲

سا پایا۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ ہجری ہیں، مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایہ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان انکا زبان ریختہ میں مشہور ہے، اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں ✦

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا"
کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، جہت، کچھ بات بھی
رازوہ کم بخت کیا تھا، میں نے جو افشا کیا

کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟
کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا

کچھ پتا بھی؟ نام اس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟
جس کسی نے آن کر مذکور اس ڈھب کا کیا

گبر ہے وہ؟ یا مسلمان؟ یا نصارا؟ یا جہود؟
اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا

شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟
موچھ ڈاڑھی ہے؟ کہ مولا نے اسے کھوسا کیا؟

ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟
مرد ہے؟ یا حق تعالے نے اسے خنثا کیا؟

نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہل حرفہ وہ عزیز؟
کون ہے جس نے اجی جا سے تمہیں بیجا کیا؟

کس محلے میں رہے ہے؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟
کوئی شیطاں ہوئے گا جس نے کہ ذکر ایسا کیا

کذب، بہتان، افترا، طوفان، غلط، بالکل دروغ
میں تمہارا نام لے لے کب بھلا رویا کیا

مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی، آفریں
میرے حق میں تم نے باور اور کا کہنا کیا

چودھویں تاریخ اک ابر تنک سا تھا جو رات
صحن گلشن میں عجائب سیر میں دیکھا کیا

چھا رہی سی چادر مہتاب، اور پر برق کا
وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا

یوں لگا معلوم ہونے، ہیں یہ دو پریاں بہم
ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ کیا

بوئے گل بولی کہ "آج آپس میں بدلی اوڑھنی
چاندنی بائی نے بی خیلا سے بہناپا کیا"

خود بدولت تو نہ آئے، اور انشا رات بھر
آپ بن رویا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی — یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ بُرا — میری طرف کو دیکھیئے! میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں — جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ! انشا سے کیں سہی

ولہ

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہے — بولا ہے "چل اُٹھ، کدھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُس کے ہم انشا
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۱۳- امانی

امانی تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آشی کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو ایکاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مؤمنین کے تئیں سعادتِ گریہ کی دولت سے داخل ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں، کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری تھے، بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضوان کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہل بیت نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس نکو کردار کے ہیں +

اُس کے کوچہ ستی غبار اُٹھا — کون ساواں سے خاکسار اُٹھا
عندلیبو بسا و آب صحرا — باغ سے موسمِ بہار اُٹھا
ہچکیاں لے گلابیاں روئیں — بزم سے جب وہ مے گسار اُٹھا

عزم رخصت ہوا جب ہی اُس کا — میرے دل سے وہیں قرار اُٹھا
نہیں جو قدرِ اشک، عالم سے — موتیوں کا مگر وقار اُٹھا
شمع سے سوز امانی پوچھا تیرا — اک دھواں اسکے دل سے یار اُٹھا

ولہ
راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل — آنکھیں تو پتھرا گئیں، پر وہ نہ آیا سنگدل
ہوچکا ہے غم سے خوں، اب جلد یہ جائے نہیں — خوف ہے یارب! نہ بدلے اور بھی کچھ رنگ دل
قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو — کر رہا ہے تیر ور پر کھوکے نام و ننگ دل
فندقِ پا کس کی دیکھی آہ! جسکے غم سے آج — قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گلِ اورنگ دل
اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہے پڑا — پر امانی آپ سے ہے سیکڑوں فرسنگ دل

ولہ
گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا — اے نالۂ دل! وقت ہے فریادرسی کا
سینہ میں جدھر رو ہو ترا پھونک دے اے آہ — ٹک دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہے کسی کا

ولہ
اُس کے کوچہ سے صبا آج اس طرف آئی نہیں — دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں
وائے اپنی اس بصارت پر، کہ ہر ذرہ میں آہ! — جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں

ولہ
کونسا دن ہے کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں — کونسا دم ہے، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں
عشق میں کس کے امانی مبتلا ہے، جس بغیر — تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں

ولہ
چمن سب لہلہاتے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں — شتاب آ، ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں
زمانہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو — تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی و کو نصیبی کو — امانی! منعم و مفلوک سبکے دن گذرتے ہیں

ولہ
امانی تو ہوا تیغ تغافل ہی ستی بسمل — بھلا بتلائے کس پر کمر اب آپ کستے ہیں

ولہ
ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں — یاد آ دیں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں
لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت — کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھے جاتے ہیں
وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے — کارواں رو میں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں کیا، کیوں کہ ان کو رام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے نہ اہد

کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں
دیکھ تو کیا ہی وہ بت سنگ دلی پر نازاں
یارو گرد ار پہ منصور نہیں دیکھا ہے۔

صفِ مژگانِ آہو چشم کا ہوں کشتہ، اے یاراں
زباں پر راز عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا

میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو
اشک، آوارگی سے تو نہ تھما

پنکوں سے دل پھپولو کیا سوخت کر رہے ہو
اور میانِ خالِ شکر لب پہ تمہارے
اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں
دم بدم اس کی خلش سے اب مجھے آزار ہے

چاہ میں کس کی دل ڈبو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل
آہ اب میرے دم کے ساتھ ہوئی
ہم سا جو ناتواں عقب کارواں رہے
صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے
خوش خواب میں ہیں، مگر جواب تک
ہے صبح کو عزمِ رفتنِ یار
آنکھیں نہیں مندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے

ولہ بتوں کے دل ہو، تو یارب یہ آہیں کام کریں
صلاح و زہد رہے یہ، تو ہم سلام کریں

ولہ جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں

ولہ تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں

ولہ نوکِ مژگاں یہ مرے لختِ جگر کو دیکھو

ولہ سرِ تربت یہ چن دیجو مرے خارِ بیاباں کو
سر رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمعِ شبستاں کو

ولہ آہ دل! کن نے لے لیا تجھ کو
میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو

ولہ پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو

ولہ بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو

ولہ اس حسنِ چند روز پہ اتنا غرور ہے۔

ولہ دوستاں یہ دل نہیں، پہلو میں میرے خار ہے

ولہ آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کفِ افسوس اب ملو بیٹھے

ولہ پاؤں پر عمر کے برات ہوئی

ولہ جوں نقشِ پا دو ایں ہوئے کہ پھر جہاں رہے

ولہ آنسو نہیں تھمتے چشمِ نم کے
جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ٹک نکلیو آفتاب تھم کے

ولہ یارب دل حیراں کو مرے کس کی طلب ہے

دم لینے نہیں دیتے ہیں ہم کے یہ نالے		کیا جانئے کیا دل کو مرے درد کُدھب ہے
ہجراں کے شب و روز کاٹ پوچھو گذرنا		دن کٹ گیا جوں توں کے، تو پھر رات غضب ہے
مدت سے سر و کار غم ہجر سے ستی ہے		کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے
نامہ بر کبھیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن	ولہ	شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بار ہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ	ولہ	باز نہیں آتا، امانی بھی عجب کوئی ہے
سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد مجھے	ولہ	دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴- امین

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی۔ عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں۔ شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادر روزگار ہیں۔ ذہن کو ان کے بندش کی صفائی میں نہایت ارجمندی ہے۔ اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے بلندی ہے۔ چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات اُنھوں نے بہ کیفیت کاٹی ہے۔ بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں زندگی بسر کی ہے۔ ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے منتخب اس کا یہاں لکھا گیا بہ تخفیف سے ہے۔

دنیا میں جو آ کر نہ کرے عشق بتاں کا		نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ کے کاوش میں پڑا ہے		مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا
کرتا ہوں امیں میں تو ثنا اُس کی و لیکن		مُنہ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا
پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا	ولہ	تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا
تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے		گر صبح نہ نکلا تھا امیں شام نکلتا

گھر مرے آنا اگر منظور تھا	ولہ	آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا
گالیاں جو دیں سو دیں اب بس کیجئے		سن چکے ہم جب تلک مقدور تھا
یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا	ولہ	تو جاوے گا تری غم رہے گا
جس کا دل آپ نے لیا ہو گا	ولہ	خاک میں لے ملا دیا ہو گا
ہم کو کیا، گر بہار آتی ہے		دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہو گا
گالیاں غیر سے سناتے ہو		ہاں میاں! تم سے اور کیا ہو گا
دل گیا ہو گا خاک میں جوں اشک		تیری آنکھوں سے جو گرا ہو گا
بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا	ولہ	یہ طفل اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا
وہی مقصود دل ہے، اور وہی منظور آنکھوں کا	ولہ	سرور سینہ میں اس کو کہوں، یا نور آنکھوں کا
کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا	ولہ	کس کو نہیں خوش آتی ہے برسات کی ہوا
جب آہ سرد بھرتا ہوں کانپے ہے تن امیں		جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا
خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا	ولہ	مہ چادر مہتاب میں منہ ڈھانپ کے نکلا
شور ہے عالم میں تیرے حسن عالم گیر کا	ولہ	تو ہی ہو گا گر کوئی ہو گا تری تصویر کا۔
عشق کی دولت سراپا میں طلا کے رنگ ہوں		اے مہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا
چوستا ہے جوں سر پستاں کو طفل شیر خوار		چابتا رہتا ہے دل پیکان اس کے تیر کا
گر ارادہ نہیں ہے آنے کا	ولہ	فائدہ اس قدر بہانے کا؟
خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں		کیا ہی جھگڑا ہے سوائکا
سخت کاوش میں ہوں یہ رنگ نگیں	ولہ	ایسی نام آوری کا منہ کالا
دل ہرا سینہ سے یوں لیتی ہے وہ زلف دوتا	ولہ	اپنے دیوانوں سے کیا رکھتی ہیں یہ زنجیر کھینچ
دیکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہے زلف		جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ
جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند	ولہ	کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

یا الٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں		بے طرح پشکہ کو ہے اُس کی کمر
دیکھ بھال اس دل صد چاک کو لیتے ہیں تباہ		میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہی ہنر
مرتے ہیں ہم تو اُس کے لب آبدار پر	ولہ	گر آبِ زندگی[۱۵] ہو تو مارے ہیں
بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو		اتنا خفا ہو کس لئے اس
اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ		بھاری ہوئے ہیں، کیا تجھے ا
دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ	ولہ	دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا
کھودیا کوہ کن نے جاں شیریں کے لئے		اس کی فرمایش کا اپنے سر سے
آ دیکھے تری زلفِ گرہ گیر ہوا پر	ولہ	جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر
ڈر سے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے		ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر
اُڑتا ہے ہو کے مضطر جا اس کے بام در پر	ولہ	نامہ مرا کہاں ہے ہے کاغ
ہے نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر	ولہ	لکھ رہا ہے نام مقتولوں کا اس
یار کے مژگاں سے لڑ جاتی ہے یوں تیر نگاہ		جس طرح تروار کوئی آ لگے
دل خیال زلف میں بے خواب و بے آرام ہے		رات ہوتی ہے ایسی بھاری
آئی بہار ہو گئے ہر خارِ راہ سبز	ولہ	لیکن ہوئے نہ آہ یہ بختِ سیاہ
شاداب ہے خط اس کے لب آبدار پر		رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہ
دل میں ترے خیال ہے کس نونہال کا		لب سے ابھی نکلتی ہے ہر ایک آ
یار آیا ہے اب نہ یہ اے چشم	ولہ	دیکھنے دے ذرا تو رہ اے جا
کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں	ولہ	گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پیے
جی نکلتا ہے، یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری		مرتے مرتے بھی ترا نام لئے
چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں	ولہ	ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی

۱۵ "آب زندگی" سے "آب حیات" مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

سیل آتی ہے تو آسنے دو مرا کیا لے گی
گھر میں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بہتے ہیں
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکر معاش
غم کو کھاتے ہیں ابیں خون جگر پیتے ہیں

وله

سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں
موبمو جی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری
ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، ابیں جو آوے یار
جان آگے نکال رکھتے ہیں

وله

بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں
ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، جو جھنجلا کے وہ
لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں

وله

مجھے بے چین رکھتا ہے دل انکا رہ پہلو میں
وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے
بسان شانہ رہتا ہے انہوں کے خار پہلو میں

وله

مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو
ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں درگذرا صاحب سلامت سے بھی
خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو
پر اتنا بھی خلوت میں ہر دم نہ ہو
ابیں کی غذا آرہی ہے یہی
الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو

وله

ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو
جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہل ہوش سے مجھکو
بھلا تو ہی کہہ اے دل کسی کو یہ توقع تھی
نکالے گا وہ ہم عہدیوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے
کوئی لے کر ملادے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دل پر داغ کے دولت
ابیں جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو

وله

کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر
گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس
تھا ابیں بے گناہ مت پوچھو

وله

جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ
وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے
ہے نگر خانۂ کبابی آنکھ

روشن ہیں شب ہجر میں یہ دیدۂ بیدار
دھڑکے ہے مرا دل کہ کہیں کچھ نہ لگا دیں

ولہ
جوں زلفیں چھکنے میں ترے کان کے موتی
لگتے ہیں ترے کان سے جب آن کے موتی

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت نہو، تو کچھ پروا نہیں
تیری آنکھوں کی پرستاری میں دل گھبرا گیا
اس زمانہ میں ایں مت کر کسی سے دوستی

ولہ
عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی
ہجر کی جب رات ایسی بے قراری میں کٹی
ہائے اس بیمار کی بیمار داری میں کٹی
شمع کی گردن، نہ دیکھی دوست داری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے
دھڑکے ہے دل کمر کو جو کستے ہوئے میاں

ولہ
بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے
باریک بال سے ہے، تا بال سے باندھئے

جلوہ ترے حُسن کا کہاں ہے

ولہ
یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہے

ہم رہیں دیکھتے اور تیری یہ اوقات کٹے
ایک دم ہوگئی گر اُس سے ملاقات تو کیا

ولہ
اور تو کیا کہوں اے شانہ ترا ہاتھ کٹے
زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات سکٹے

رنگ چہرے کا زعفرانی ہے
کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھ کو
شمع رویاں سے اتنا گرم نہ مل
رات دن بھیکتے ہی جاتا ہے

ولہ
عاشقی کی یہی نشانی ہے
دیکھا یوسف تو تیرا ثانی ہے
ان کی جو بات ہے زبانی ہے
کیا ایں ایسی زندگانی ہے

خضر نے ایک دم پیا تھا لے کے آب زندگی
کیا بھلا اس میکدے میں جی کسی کا شاد ہو
معنئ آرام کیا ہے، تو نہ کچھ سمجھا ایں

ولہ
مانگتے ہیں اب تلک اُس سے حساب زندگی
مرگیا آخر کو پی جن نے شراب زندگی
ہم تو مدت سے اُلٹتے ہیں کتاب زندگی

غیر سے کیوں کہ وہ چھوڑے ملنا

ولہ
چھوڑتا ہے کوئی اپنے بانے

ہم کھڑے تھے سامنے، اور اغیاروں میں تھے
جتنے تھے محفل میں، تھا سب سے تپاک و اختلاط

ولہ
ٹک تو منصف ہو جئے، ہم کبھی یاروں میں تھے
ایک ہم کم بخت گویا وہاں گنہگاروں میں تھے

مصرع اول		مصرع دوم
ہاتھ اُٹھانا جان سے پیارے نپٹ دشوار ہے		کیوں نہ دیکھا کل سب ہی تو نازبرداروں میں تھے
بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی	ولہ	دنیا میں جو ٹھانے تھے میاں، ہم نے نباہی
خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے		اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی
کیا دین سے غافل ہیں ایس مردم دنیا		سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی
تمہاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں، نپٹ ہی لگتی ہیں پیاری پیاری	ولہ	پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی، یہ کافر آنکھیں ہیں یا کٹاری
تری نگہ کے جو ہوں گے مارے، نہ مانگا ہو کا انہوں نے پانی		نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری
اظہار نہیں اگرچہ سر کا	رباعی	پر بوجھ اُتاروں ہوں میں اپنے سر کا
سائل کو جواب ترش ہر گز مت دے		بھوکا ہے، کیا کرے گا لے کر سرکا
یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک	رباعی	بس کیجئے، پاس آشنائی کب تک
کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور		دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک
کیا شہر میں آج مجھ پر ہے ہولی۔	رباعی	پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی
وعدے سے کیا کروگے دل خوش کبتک		ہولی کا قرار تھا، سو یہ بھی ہولی
ایک ہیں آشنا مرے غم خوار	مثنوی	پوچ گو بیوقوف بد اطوار
ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں		کہتی شرماتی ہے گی منہ میں زباں
دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں		گھر میں ڈھونڈو تو بھونے بھانگ نہیں
منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے		گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے
چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا		پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا
آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں		مالکِ چار دانگ عالم ہیں
دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت		یاد آتی ہے چین کی مورت
گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ		لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ
تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ		جوں جڑی ہوں کواڑ میں گُل میخ

ہیں تو کرتا نہیں سخن چینی | ناک ہے جوں کواڑ کی بینی
آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے | حلقۂ چشم حلقۂ در ہے
کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف | جوں ڈفالی کا ہوئے پھوٹا دف
منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو | لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو
ان کے دھارے کو دیکھ کر فی الحال | جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال
دیکھ نقاش اس کی پیشانی | کھینچتا دل میں ہے پشیمانی
کھوپڑی سر سے ہے گی یوں اٹکی | جوں کہ چوطے پہ اوندھی ہو مٹکی
توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی | پیٹ تے ہووے پیٹ سے جیسی
صاف کہتا ہوں میں بہ مجبوری | ناف ہے جا ضرور کی موری
کیا کہوں اس کی اور بد حالی | منہ ہے چکنا تو پیٹ سے خالی

دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پہ
بتاں اٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے
ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو خجل ناصح
نہ اٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا

ایں ضعیف میں اتنا ہوا بقول فغاں
کیا برا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی
بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں
میں گذرا یار کے ملنے سے جاؤ جس کا جی چاہے
حیات جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اس کی

ولہ بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے
ولہ رہے ہے سنگ کتیں لاگ آبگینہ سے
ہماری جیب کو ہے کیا لگاؤ سینے سے
مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے
اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے
ولہ جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی
کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی
ولہ غرض اب شوق سے عاشق کہاؤ جس کا جی چاہے
اگر باور نہ آوے آجا کے کھاؤ جس کا جی چاہے

ولہ
یار بھی اب گلہ لگا کرنے | یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی
ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا | عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا		بریں جامہ ترے دو دامی ہے
زاہد کبھو تو گرد نہ پھر یو شراب کے	وله	یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے
کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر		دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے
پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو	وله	کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے
کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے	وله	جو کوئی چاہے کسی کو اے میاں اُس کی سزا یہ ہے
برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبہ کے تئیں زاہد		پرستش ہم جسے کرتے ہیں، وہ نام خدا یہ ہے
رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا	وله	یار کے بھا دیں تماشا ہے، تماشا یہ ہے
اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی	وله	اپنے تئیں اب آپ ہنسا تی ہے چاندنی
مُنہ دیکھو تیرے سامنے آکر سفید ہو		ماٹی میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی
دو دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات		ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی
گر آمد آمد اس مۂ تاباں کے تئیں ایں		کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی
غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے	وله	گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے
دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے		پر ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۱۵ـ افسوس

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سیّد مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانۂ نواب میر قاسم خاں عالیجاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمٰعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف ایک مکان ہے علاقہ میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آکے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور ہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سیّد مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم

کی رفاقت میں سررشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عزو وقار کے ساتھ توپ خانے کی داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالہ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب عمدۃ الملک کے سید غلام علی خاں کو نیابت صوبہ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی آخر فالج بیماری سے انہوں نے سیر روضۂ رضوان کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان خانان حالم بقاء اللہ خاں مرحوم نے لکھنو میں انہیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے مشاہرہ میں تین سو روپے کا واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دار الخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھہرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے، اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے بموجب طول کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر معہ صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہیں وصال انکا ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن انیس [19] برس کا تھا شعر و سخن کے ساتھ موانست ان کو بہ شدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں، اور اکثر اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں،

گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم وعالمیان میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کی عنایت اور قدردانی ازبسکہ حد سے زیادہ دیکھی، سعادت توسل کی انہوں نے ملازموں میں اس عالی جناب کے حاصل کی۔ جس ایام میں اس نیر اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے بتوکل و قناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کر رہے تھے، کہ صاحبان والا مناقب عالی شان بارلو صاحب نے، مشورے سے عالی قدر سخن آفرین مسٹر گلگرسٹ صاحب، زباندان ریختہ لکھنؤ سے طلب کیے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے، کہ نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپے کا ٹھہرا کے، پانچ سو روپیا خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشد آباد میں یہ آئے، تو وفور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا، اور وارد مرشد آباد کا تھا، دیدار سے اپنے انہوں نے نہایت خوش و خرم کیا۔ اور چلتے ہوئے وعدا کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں۔ اور گلستاں کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے انتخاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی و انکساری میں فرد کامل ہیں، منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں +

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بت پر غرور کو
اُس بت نے حجاب کا دیوں ابھی اٹھا نقاب
پاتی نہیں فقط نہیں ڈوبی ہے سب کی زیب
سچ ہیں یہ خودنمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں

صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
دیکھ سکے گا پرا سے تاب ہے اتنی طور کو
دیکھنا آج ہم نشیں آنسوؤں کے وفور کو
شعلۂ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو

ناز بھرا وہ منہ، اگر دیکھے جو اک نظر تو پھر || منہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکر حور کو

دو کسو نہ طعنہ زن مجھے ناکسوں کی خوشامدیں || میں نے تہی کی نہیں فقط، کرتے ہیں سب ضرور کو

تو نے افسوس کیا کیا، دشمنِ جاں کو دل دیا || یہ تیری عقل جل بجھے، آگ لگے شعور کو

ولہ

سمندِ گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا || غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا

تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بے چینی || مگر پیام کسی بے قرار کا پہنچا

ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ رو ہر دم || یہ مرتبہ تو دلِ داغ دار کا پہنچا

ہے یہاں تلک تو نزاکت گلوں کے گجرے سے || لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا

قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس || حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا

ولہ

جب تلک عشق یارو، نہ دلِ ناکام تھا || اپنے میں کیا چین تھا، اور دل کو کیا آرام تھا

بخشیو ہم کو تجھے ٹوکا ہے ہم نے بھول کر || دردِ دل تیری بلا ہو، وہ ترا ہمنام تھا

ولہ

اس کے اُٹھتے ہی جی پہ آن بنی || دیکھیے آگے آگے کیا ہوگا

ولہ

صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیش تر || ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیش تر

دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار || بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر

ولہ

ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر || روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر

غیروں سے تو ملے تو ملا کر، ولے مجھے || کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر

ولہ

بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ اُٹھ سکتے ہیں || چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

ولہ

کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے || تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے

ولہ

کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا ہے وہ اے ناصح || تجھ کو نہ خوش آیا یہ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۱۶- آشفتہ

آشفتہ تخلص، حکیم رضا قلی خاں نام، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع خاں مرحوم تھے،

متوطن اکبر آباد کے۔ بڑے بھائی ان کے میرزا ہجو صاحب، خدا مغفرت کرے، ذرہ تخلص کرتے تھے عجب ولولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلیٰ گئے، اور وہیں خاک ہوئے، روبرو ضریح مقدس کے دفن ہیں۔ حق سبحانہ تعالےٰ حشر بھی ان کا، اور جمیع مومنین کا، جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے۔ دوسرے بھائی ان کے، میرزا رضی صاحب، وہ بھی ان سے بڑے ہیں، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کئے، دیکھنے کا کیا دخل ہے، کسی نے نہیں سنے۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا ناز و اعزاز کیا کئے ہیں۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں۔ جوان آزاد وضع، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج، اور مایۂ ارتباط میں محبت، اور یکرنگی میں خلاصے، اور آشنائیوں کے بہت خاصے حسن پرستی میں خود لیلیٰ و شیریں کی تصویر، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر، ہیں۔ مشورا سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی نہیں ہوا ہے۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی ہے، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی ہے۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے، اس سبب سے دو ڈھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے۔ ۱۲۰۸ھ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھلائے، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے، خلف الصدق سے ان کے، یعنی نواب عضد الدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے، نہایت موافقت آئی، اور صحبت نے بہ شدت یک رنگی پائی۔ چناں چہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے،

اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشدآباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرہ ذی حجہ کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور راگ رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں۔ طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، وگرنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں — یہاں تلک انتظار تھا دل میں
آبلہ ہو کے دم میں پھوٹ بہا — یہ کہاں کا بخار تھا دل میں
مر گئے پر بھی ہم کو خاک نہ دی — آج تک یہ غبار تھا دل میں
کھینچنے ہی تک اے کمان ابر — تیر مژگاں دو سار تھا دل میں
دم آخر جو ہچکی آتی تھی — وہ فراموش گار تھا دل میں
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے — شوق بوس و کنار تھا دل میں
دم شماری تلک بھی آشفتہ — قدموں کا شمار تھا دل میں

ولہ

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ — ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا — ہمارا دل ہے پریشان، دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر — تمہارے جی میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی — ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف — جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہووے گی تصدیع لیکن آشفتہ — کوئی گھڑی کا مہمان، دیکھتے جاؤ

وصل اس کا خدا نصیب کرے		ولہ	دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہجر ہے قتل، وصل سے احیاء			حب میں جو آوے، سو حبیب کرے
گل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا			شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مر گیا ایک صنم پر آشفتہ			موت ایسی خدا نصیب کرے!
یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے		ولہ	جند بھی ڈرنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں			کون بر آوے بھلا، اس دل دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے			فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے			آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے
دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے			اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر			ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے
مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب بھاگ لگے		ولہ	آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چمٹا، تو لگا کہنے مجھے			بس کہیں دور بھی ہو، مُنہ کو ترے آگ لگے

باب البا

۱۔ بیدل

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انہوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبع مستقیم، کے باعث تصویرِ نازک خیالی کی بہت نکہ سکھ کی کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انہوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں لیکن اہلِ محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے، اور موردِ الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم و عالمیان کے رہتے تھے۔ قوت جسمانی اور طاقت بدنی قادر قوی نے اتنی انہیں عنایت فرمائی تھی، کہ اوران کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی

چناں چہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے وداوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقہ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے ردی خلائق سے یہ بیزار ہوئے، کہ روزگار پاکشیدہ، اور دنیاداری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا، دل کو فراغ یاس اور خونِ تمنا سے رشکِ گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرت اعتقاد سے مسجدِ خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیرانِ عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکزِ دائرۂ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطبِ آسمانِ توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیتِ فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے۔

اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ پر لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے۔

کب عوض دنیا کے سرکوں، جا کے چھوڑوں ٹھاؤں کو باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کلیات ان کا از روئے نظم و نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ از بس کہ مدار دنیائے دو روزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادر سخن کے نام سے شہرت ہے پائی۔

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں	اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں
۵۷ دنیا اگر دہند، نہ جنبم ز جائے خویش	من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا | پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے، ہم ہیں

۲- بیان

بیان تخلص، احسن اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے میرزا مظہر جان جاناں کے تھا سکونت دلی میں اختیار کی لیکن متوطن اکبرآباد کا تھا۔ شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں +

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا | در کے باہر مدعی جوں صورتِ دیوار تھا
اس تجاہل پر پڑا میں یہ سمجھتا ہوں گو میں | وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا
دیکھ کر تابوت کو، بیمارداروں سے مرے | پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا

ولہ

کوئی کسی کا بیان، آشنا نہیں دیکھا | سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا کہیں دیکھا

ولہ

آ کر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا | اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا
کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے | کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا

ولہ

عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا | اے آسمان بنا تو، مجھے تو نے کیا دیا
نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر | اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا
ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے | خوابِ عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا

ولہ

کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا | ایک بیگانہ ہے مجھ سے، اور سب سے آشنا
غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی | دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا

ولہ

ہم دم نہ فکر کر، کہ مرا کام ہو چکا | گر دل مرا یہی ہے، تو آرام ہو چکا
آتا ہے تجھ کو ننگ، مرے نام سے عبث | اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا

ولہ

اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خواب شیریں سے | ہمارا کیا گریباں، ناصحوں کا پیرہن پھٹتا

مصرع اول		مصرع ثانی
جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے!	ولہ	مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا
تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے	ولہ	یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یکبار مست
رو کر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار آج	ولہ	مسکرا کر وہ لگا کہنے، کہ اس کا کیا علاج
یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ	ولہ	بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ
وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا		قلم کے بن کو لگے آگ ! اور جلے کاغذ
عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی آ سکتی نہیں	ولہ	رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر
اک بار فوج عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر۔	ولہ	لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر
لینا اگر ہے دل کو، تو لے بھی اسے کہیں		سینہ میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ کر
ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی، کہ مثلِ خار		پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر
کیا ایسے سے دردِ دل کو کہئے	ولہ	ادھر تو سُنا، اُدھر فراموش
میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا	ولہ	تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف
تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی	ولہ	مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو، تو کافر ہوں
کافر ہو، جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو	ولہ	اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں، اور تو ہو
مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی	ولہ	جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی
آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے		سی دیجیو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی
جہاں روؤں تمنا میں تری اے شمع رو پیارے		اوگے اس گل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے
قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے	ولہ	اُسے کہتے ہیں عاشق، جو کوئی یہاں نقد جاں ہارے
آنسوؤں تک پوچھنے کی غیر کے تدبیر ہے	ولہ	مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا، کہ کیوں دل گیر ہے
چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں		لیلیٰ و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے
شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے	ولہ	یہی ہے صبح سے دھڑکا، کہ رات آتی ہے
جا کہو کوئے یار میں کوئی ۔ ۔	ولہ	مر گیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا — سر رکھے اس کنار میں کوئی

ولہ

جادو تھا، کہ سحر تھی، بلا تھی، — ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہے، کہاں ہے ناخوشدلی تو — ہم سے کبھو تو آشنا تھی

ولہ

رسوا ابھی سے کرتی ہوائے چشم تر مجھے — آتا ہے اس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا — پھرنے چلا ہے یہ دل وحشی اُدھر مجھے
کُنج قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی — تو کیوں دیئے فلک نے میاں بال و پر مجھے

ولہ

جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے — وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے
پیو شراب جوانو! کہ موسم گل ہے — ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہے

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے — دشمنِ جانی ہی میرا، جو کوئی چاہے مجھے

کوئی مجنوں قیس نہ دیوانہ ہوا لیلی کا — میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جدھر مجنوں ہے

ولہ

کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دیکھی صبح — یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح
ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا، کہ اودھر — ہمسایہ پکارا، کہ ہوئی کب کی صبح

رباعی

جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا — عالم کی غضب سے جان کھوتا ہیں گا
غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں — زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا

رباعی

مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہے — یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ — اتنا کہیو، کہ اب تلک جیتا ہے

رباعی

سو طرح سے یہ عشق لبھاتا ہے مجھے — ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب! — ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

رباعی

کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے — مدت گذری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا محروم — منہ یار کا دیکھ لیوے، مرتے مرتے

۳۔ بقا

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا، شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکین تخلص کے تھا، فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج، و باریک بین، و معنی بند، و سخن آفرین تھا میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھا، اور اس نہنگ بحر معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکر ربکا، لیکن میرزا مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی، اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آ کر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کئے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنون ہوئے، اور جیتک جئے سودائی رہے سنہ ۱۲۱۱ بارہ سو چھ ہجری تھی، کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی، کہ تحصیل دولت عقبیٰ کی کیجئے، اور خاک راہ سے کربلاء معلا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجئے۔ یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے، اور منزل مقصود کی طرف قدم گذار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بہ خیر ہوا +

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں +

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروئے خمدار کی		آج کچھ ناخن بدل ہے آہ! اس بیمار کی
دیکھئے، ہیں منصب مجنوں پہ یہ لیلی صفتاں	ولہ	خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں
کیا خط لکھیں اُس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے	ولہ	خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشت ششم ہے
کس نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو	ولہ	غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو
اس لب سے کچھ نہ چوسے قدح، اور قدح سے ہم	ولہ	تو کیوں ٹلے سبو سے قدح، اور قدح سے ہم
پاتے ہیں میکدے میں بقا روز فیض مے		خم سے سبو، سبو سے قدح، اور قدح سے ہم

۴۔ بیدار

بیدار تخلص میر محمدی نام، شاہ جہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا، اور زباندانان دلی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں کہتے ہیں کہ کلام اپنا انھوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اُس نقادِ بازار معانی سے فایدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ✦

تو نے جو مدتوں میں ادھر کو گذر کیا
نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا

غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف
جس دل میں تو مقیم تھا واں غم نے گھر کیا

ہم غافلوں کی آہ نہ اودھر نظر گئی
اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا

اس کھیل سے کہ اپنی مژہ کو کہ بار آئے
عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا

دیوانے کو پری سے پھر اب کر دیا دو چار
اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا

کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا
میں نے بلند دست دعا ہر سحر کیا

بیدار ایسے رونے سے امان بار آ
داماں و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا

ولہ

آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبسکہ نور تیرا
ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا

بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوہ
اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا

ولہ

جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی
کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

کہنے لاگا دلِ گم گشتہ ہے تیرا مجھ پاس
جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

ولہ

یہ کون پئے شکار نکلا
ہر دل ہوا اُمیدوار نکلا

جینے کی نہیں ہے اس مجھ کو
تیر اُس کا جگر کے پار نکلا

ہم خاک بھی ہو گئے پر اب تک
دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہوکر — وہ صبح کو ایک بار نکلا
اُس روز مقابل اُس کے خورشید — نکلا بھی تو شرمسار نکلا

ولہ
نالہ ہرچند ہم نے کر دیکھا — آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا
آج کیا جی میں آگیا تیرے — مُتبسّم ہو جو ادھر دیکھا

ولہ
بہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشک سُرخ ایسے — مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے سبو ٹوٹا

ولہ
سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا — حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظروں میں مری آنکھوں میں سیاہ — رات اس زلف میں دل کہ گرفتار ہوا

ولہ
کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجوں — تا کہ معلوم کرے حال پریشان ہما

ولہ
اے شانہ کھولیو گرہ زلف سوچ کر — دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

ولہ
ہم چشم ابر دیدۂ تر گرچہ ہو سکا۔ — لیکن غبارِ غم مرے دل سے نہ دھو سکا

ولہ
جواب کے چھوڑے مجھے غم تری جدائی کا — تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا
اُگے ہے پنجۂ مرجاں مزار سے اُس کے — شہید ہو جو کوئی اس کفِ حنائی کا
مرے قدم سے ہے سرسبز بوستان جنوں — ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا

ولہ
کہو تو کس سے میں پوچھوں نشان خانۂ دوست — کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست

ولہ
حال سُن سُن کے ہنس دیا میرا — کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ولہ
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا — سرخ مے کالی گھٹا اور سبزی مینا کا رنگ

ولہ
اس سے دوچار ہو گئے ہم — سو جی سے نثار ہو گئے ہم
فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ — اب تیرے شکار ہو گئے ہم

ولہ
آ تیری گلی میں مر گئے ہم — جی تھا سو نثار ہو گئے ہم

ولہ
خاکِ عاشق ہے جو ہوتی ہے نثارِ دامن — اے مری جان تو مت جھاڑ غبارِ دامن
خلشِ خارِ رہِ عشق سے اب اے ناصح — نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تارِ دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں | ولہ | ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
شبِ ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں | ولہ | صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں

صورت اس کی سما گئی دل میں | ولہ | آہ کیا آن بھا گئی دل میں

تم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں | ولہ | یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں

اُٹھ گیا ہم سے گو مکدر ہو | ولہ | خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو
اس سے بیدار بات تو معلوم | | دیکھنا بھی کہیں میسر ہو
تعجب ہے کیا ناتوانی سے میری | ولہ | کہ فصاد شرمندۂ نیشتر ہو
دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار | ولہ | واہ واہ ہے تری صیادی کو
دیکھ آ کر مری آنکھوں کی بہار | | کر دیا باغ ہر اک وادی کو
تری مجلس میں اگر ہو گذرِ پروانہ | ولہ | نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظرِ پروانہ
ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ سوختگاں | | شام کہتے ہیں جسے ہے سحرِ پروانہ
بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا | | دیکھو اے بزم نشیناں ہنرِ پروانہ
قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار | | رشتۂ شمع سے باندھا ہے پرِ پروانہ
دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ | ولہ | دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہی بلائیں شانہ
اُس کے بھر آئے ترے مرہم کاکل سے زخم | | ہاتھ اُٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ
ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتہ ہوئی | | دیکھ لے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ

تھم گیا اشک شبِ ہجر میں روتے روتے | ولہ | سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے
مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن | | کون سی شب کہ نہ گذری مجھے روتے روتے
کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے | ولہ | بلبل زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے
کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو | | جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

عاشق کا اگر دیدۂ خونبار نہ ہووے | ولہ | تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

بخشی ہے جسے تجھ نگہ چشم نے مستی / وہ مست قیامت کو بھی ہشیار نہ ہووے
بیجا ہے شکایت ستم یار کی بیدار / ممکن ہے کہ معشوق دل آزار نہ ہووے

وله
نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے / اے ستمگر یہ کیا قیامت ہے
گلِ صد برگ دیکھو اس کے ہاتھ / دلِ صد چاک کی کنایت ہے

وله
جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے / شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

وله
کہاں ہے تو کہ میں کھینچوں ہوں راہ میں تیری / برنگِ نقشِ قدم انتظار آنکھوں سے

وله
ابتک مرے احوال سے وہاں بیخبری ہے / اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

وله
فولاد دلاں چھوڑیو زنہار نہ مجھ کو / چھاتی مری جوں سنگ شراروں سے بھری ہے
کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج / کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیمِ سحری ہے

وله
لبِ رنگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی / زیب دیتی ہے تجھے نامِ خدا کم سخنی
ہار پہرے تھے جو پھولوں کے نشاں ہیں ابتک / ختم ہے گلبدنوں میں تری نازک بدنی

وله
نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے / اتنی رخصت دیجئے بندہ نوازی کیجئے

وله
زاہد اس راہ نہ آ مست ہیں میخوار کئی / ابھی یہاں چھین لئے جبّہ و دستار کئی
کف پا ہیں ترے صحرا کی نشانی بیدار / مر گیا تو بھی پھپھولوں میں رہے خار کئی

وله
سیرِ مجلس رنداں آج وہ شرابی ہے / خونِ دل جس سے مرا بادۂ گلابی ہے
ترے اے پری پیکر سینہ پر نہیں پستاں / طاقِ حسن پہ گویا شیشۂ حبابی ہے

وله
دوستو جانے دو اب ہاتھ اُٹھاؤ ہم سے / یہ ہے وہ زخم کہ بہ ہو نہ کسی مرہم سے
مہرباں خیر تو ہے کس پہ یہ غصہ کیجے / آج آتے ہو نظر کچھ تو مجھے برہم سے

وله
جو کچھ چاہئے آپ فرمائیے / پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
ڈراتے ہو کیا قتل کرنے سے ہم کو / اگر یوں ہی جی میں ہے آ جائیے

رباعی
بیدار رواں ہے اشک دریا دریا / بتلا تو کہ ہے دیدۂ تر دریا دریا

رونے سے ترے تمام خانہ ہی خراب		حیران ہوں میں اس میں ہی گھر بہا دیا

۵۔ بسمل

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار کھڑکی۔ چند مدت انہوں نے عظیم آباد میں گذر کئے ہیں، اور تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں سیر نگر سے بلدۂ محمد آباد و بنارس ہیں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا آزاد وضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصۂ افکار ہیں۔

نالۂ درد و الم میں نے جب آغاز کیا		جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا
اتنا ہی داغ عشق سے معمور ہو گیا	ولہ	سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا
یار تیری ہی زلف میں دیکھا	ولہ	ایک زنجیر لاکھ دیوانہ
کیا خیال آوے بلاؤں سے اُسے پرہیز کا	ولہ	ہے جو بیمار اس تری چشم بلا انگیز کا
آگ ہر ساعت برستی ہے نہ تنہا چشم سے		ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا
جب غمزۂ چشم یار دیکھا	ولہ	سو تیر جگر کے پار دیکھا
یاد آ گئی مشتِ خاک اپنی		اُڑتے جو کہیں غبار دیکھا
دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا	ولہ	گو سدا دامن کو اپنے یہ جھٹکتا ہی رہا
جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح		میں کبھی ادھر کبھی اودھر بھٹکتا ہی رہا
خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا	ولہ	دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا
کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہوگا	ولہ	کیا کیا نہ کیا ہوگا جب دل کو دیا ہوگا
دل میں برنگِ موج تمہارے وصال کا	ولہ	بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا
ہر دم مجھے نیاز اُسے ناز ہی رہا	ولہ	انجامِ کارِ عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے | اُڑنے سے جب مرا پر پرواز ہی رہا

ولہ

سدا نکلا ہی کرتا ہے پگھل کر آتش غم سے | سرشک آنکھوں سے میری روغن بادام کی صورت
خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو غیر بسمل کے | تمہارے خنجر مژگان خون آشام کی صورت

ولہ

تیر نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر | چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر
یہ داغ عشق مثل سینے نئے نواز کے | نکلے ہے بند بند سے اب پھوٹ پھوٹ کر

ولہ

پہلو میں رکھوں میں دل ناشاد کہاں تک | اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک
در آج قفس کا ہے کھلا کیجئے پرواز | اے ہم قفساں خاطر صیاد کہاں تک

ولہ

زمانے سے نرالے ہیں جگر افگار کہتا ہوں | کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تروار کہتا ہوں

ولہ

جز یاد حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ | دے سبحہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ
ہر دم ہو و قبضہ شمشیر کی طرح | رہتی ہے ابرووں میں ترے تند خو گرہ

ولہ

دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی | کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی
درد و الم سے منزلت دل ہے بس بلند | یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی

ولہ

لے خانہ اس غلام ارشاد کیجئے | گو کام کا نہ ہووے تو آزاد کیجئے
کوسے بتاں تلک تو رسائی محال ہے | جب تک یہ مشت خاک نہ برباد کیجئے

ولہ

پیارے یہ وضع چشم مروت سے دور ہے | دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے

ولہ

رو برو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجئے | پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجئے

ولہ

اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے | ٹکرا لیا کرے ہے جو منت کوہسار سے
آوارگی سے باز رکھوں آہ کس طرح | دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے

ولہ

گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے | ہر بن مو جوش سے آنسو کے فوارے ہوئے

ولہ

پیش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیش آنی | اب یہ در دولت ہے اور اپنی یہ پیشانی

ولہ

عشق کی بازی میں بسمل دل جلے ور کارے ہے | کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہی جی ہارے ہوئے

تیری ہی یاد و ذکر ہی تیرا ہر آن ہے	ولہ	گویا کہ اس لئے مرے مُنہ میں زبان ہے
عہد و پیمانِ بتاں بسکہ بہ سالوسی ہے	ولہ	ایک اُمید تو سو باعثِ مایوسی ہے
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے تیرے کہ تمام		مو بہ مو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے
آیئے جلد کہ یہ بسمل مجروح ہنوز		ہر لبِ زخم سے مشتاقِ قدم بوسی ہے
دُکھ درد کو کب تلک حکایت کیجے	رباعی	دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجے
اس کشورِ دل پہ فوجِ غم کا ہے ہجوم		یا شاہِ نجف میری حمایت کیجے

بابُ التّاء

۱۔ تانا شاہ

نام نامی اور اسمِ گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تانا شاہ ہے۔ سلاطینِ نامدار اور خواقین عالی مقدار دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرا عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیش مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سرِآراے بزمگاہ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔ جس ایام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تانا شاہ بھی نظر بندی میں آئے، اور فلکِ نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھا سامانِ عیش سب برہم ہوا، اور مجمعِ اسبابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا، لیکن حُقّہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہوگی وہ عین عنایت ہے۔" ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حُقّہ ایک دم مُنہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشہ سے گلاب کے حُقّہ تازہ

ہووے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگووے، شغل میں عیش ونشاط کے ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خالص اور عرق بید مشک کے دن رات میں خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس عجز سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے حکم فرمائیے۔ سبحان اللہ! یا تو حقہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دودِ محفل کے رشک سے دھواں حسد کا حقہ سر آسمان میں گھٹتا تھا، یا پیچ سے فلکِ حقہ بازی کی آٹھ چلمیں دن رات میں پیتے تھے، اور گھونٹ گھونٹ کر عجب پیچ وتاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقہ کے مصرف میں آنے اسراف سے، اور امورات شرعی میں پاسِ خاطر بیجا بیجا، اور تکلفِ رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کرے ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔" جب حضور سے ہر روز آٹھ شیشہ آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سن کر خلد مکان نے ضد کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انہوں نے اپنے حقہ بردار کو دو چلموں کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے، تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے تھے جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انہوں نے عرض کیا۔ جہاں پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہا سال پلا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڑی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلال کا زمین میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے، اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گر اُس کر، نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرفِ بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سر پہ ہاتھ دھر کے روتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ نہ پیا، جبتک کہ ان کی نظر بندی میں رہے، اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے سبحان اللہ! چشم حقیقت بین سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ زحمت +

کدھر ہیں خسرو وجم لطف کیقباد کدھر	کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مست جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے	کچھ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشور ستانی کے معاملہ کو سمجھنا شاہان عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے، لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد[1] کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے۔ تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا، اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا اعجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا۔

واقف رموز ملک سے ہیں شاہ و شہریار[2]	ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول

غرض شاہ عالیجاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں، اور باعتبار محاورۂ دکن کے، اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے۔

کس وں کہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ بھل بجھرا ہے	اک بات کے ہونگے سجن، یہاں جی ہی بارہ باٹ ہے

۲۔ تاباں

تاباں تخلص، میر عبدالحی نام، شاہ جہان آبادی۔ نہایت عزیز خوبصورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھ جان سے دین و دل نذر کرتے تھے، اور پرے کے پرے عاشقان جانباز کے یاد میں اس لب جاں بخش

---

[1] مکہ مسجد حیدر آباد میں اب تک موجود ہے۔ اس کا کھدوانا خلاف واقعہ ہے ۱۲

[2] مصنف نے حافظ کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ع

رموز مملکت خویش خسرواں دانند	گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے، اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنیٔ درد سے آگاہ، اس سرد مہری اور لیلی صفتی پر مانند مجنوں کے ہمیشہ سرگرم نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے، اور اُس کے درد محبت سے، باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان، کہ بالفعل شاہ سلیمان کر کے معروف تھا، اور ادا کرنے میں راہ و رسم درویشی کے بہ شدت مصروف، اس مورِ ضعیف نے عالم پیری اُس کا سنہ ۱۲ بارہ سو ایک ہجری تھے، کہ بلدۂ لکھنؤ میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا، لیکن اُسکے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے +

غرض میر عبدالحی تاباں تخلص میرزا جان جاناں مظہر سے اور میرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سودا بنابر اک نظاقہ مہر کہ ایکا اوس کے حال پر تھی پر اکثر اشعار کو اوسکے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں، کہ زمان فرمان فرما محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حُسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے +

سر سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا		آخر خزاں نے کچھ نہ اُکھاڑا بہار کا
اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ		شاید گرا ہے جسم کسی بے قرار کا
کس کس طرح سے دل میں گذرتی ہیں حسرتیں		ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا
اخگر کو چھپا رکھیں، میں دیکھ کے سمجھا	ولہ	تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہیگا
کوئی دوسرا مجھ سا تاباں نہ ہوگا	ولہ	کہ دل دے تجھے پھر پشیماں نہ ہوگا
جفا سے اپنی پشیمان نہ ہو، ہوا سو ہوا	ولہ	تری بلا سے مامرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم		وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

بیتابیوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج	ولہ	تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا	
آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا	ولہ	جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا	
ہیں بہت جامہ زیب، پر ہم نے		کوئی دیکھا نہیں یہ چپ ڈھب کا	
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا		ایسا قاصد تو جائیو لپکا	
دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج چیکے جامہ کی	ولہ	اُسی کا لے کے دامن کیجیو یارو کفن میرا	
لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے	ولہ	وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا	
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا		نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا	
ہونٹوں پہ تیرے ظالم مستی کی یہ دھڑی ہے	ولہ	یا اُن کے تئیں کسی نے مل مل کیا ہے نیلا	
اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا	ولہ	اسے دیکھ کانٹوں پہ گل لوٹتا تھا	
لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے	ولہ	ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا	
فغاں نے مرا منہ پھر آ کر کھلایا[1]		ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا	
مری لوح تربت پہ یارو کھدانا	ولہ	نہ اس سنگ دل سے کوئی جی لگانا	
ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک تو مجھکو		اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا	
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے	ولہ	کہ کچھ حاصل نہیں ہونیکا ساری عمر رو بیٹھا	
صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا	ولہ	کہ تجھ بن رہیں ہم، کہاں یہ کلیجا!	
کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا		ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا	
ایسے کے تئیں کوئی سر پر بھی چڑھاتا ہے؟	ولہ	کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ	
تمہارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب	ولہ	خدا جانے جئیں گے یا مرینگے ہم میاں صاحب	
مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن	ولہ	لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہی کیا قدرت	

[1] یعنی کھلوایا ۱۲

ولہ
غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج
میں ہوں اور ہاتھ ہے اور میرا گریبان ہے آج

ولہ
لے میری خبر چشم مرے یار کی کیوں کر
بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

ولہ
کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں ہیں یہ باتیں
اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

ولہ
سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آئیاں ہیں
کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں

بیمار ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن
نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں

قسمت میں کیا ہو دیکھیں جیتے رہیں کہ مر جائیں
قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ولہ
آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہئے
پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں

ولہ
شب کو پھرے وہ رشک ماہ خانہ بخانہ کو بکو
دن کو پھروں میں دادخواہ خانہ بخانہ کو بہ کو

ولہ
گئے نالہ ترے برباد جوں بانگ جرس چپ رہ
اثر دیکھا تری فریاد میں دل ہم نے بس چپ رہ

ولہ
سلیماں کیا ہوا گر تو نظر آتا نہیں مجھ کو
مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے

ولہ
بتاں کے شہر ناپرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے
مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے

ولہ
تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے
کیا بھلا چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے؟؟

تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز
گوشت ناخن سے کہوں کوئی جُدا ہوتا ہے

ولہ
ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے
تجھے بے مروت مروت کہاں ہے

میں شکوہ کروں جور ظالم سے لیکن
مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے

بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی
مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے

جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہو تاباں
رگِ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے

ولہ
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے
تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے

ابھی پست ہو جاگا[5] لاتوں کے مارے
ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

[5] ہو جاگا یعنی ہو جائے گا۔

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی | بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمار شب کا لا، صبح ہوئی | شیشے میں جو کچھ کہ ہے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ | نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہی ویرانہ
خوش آتا ہی مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا | ارے ناصح عبث ہی یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پر یہ وہ ہو جُدا جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ

عبث مت بک نہیں میں مانتا کہنا ترا ناصح | مری آہ و فغاں کرنے سے بتلا تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت تو ستا ناصح | بھلا چاہے ہے تو اپنی آبرو کہے کے جا ناصح
مجھے بے طرح آتا ہی تری باتوں پہ جھنجلانا

تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر | سنوں کیونکر تری باتیں کہ میرا حال ہی ابتر
رہوں آرام سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر | کہ میری زندگی اور موت ہی موقوف اس جا پر
اگر آوے تو جی جانا و گر جاوے تو مر جانا

کبھی راتوں کے تئیں کرتا ہوں گھر میں نالہ و افغاں | کبھی پھرتا ہوں صحرا بیچ میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہی تاباں ساتھ میرے محشرِ طفلاں | مرے تئیں اس طرح سے دیکھ کر سب خوار و سرگرداں
کوئی کہتا ہی سودائی کوئی کہتا ہی دیوانا

باب الجیم

۱- جہاندار

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمانِ بلند اختری اور سرفرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو، زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشورستانی کو، ہر خط جبینِ جہاں افروز کا اُس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے، دور کرنے والا تاریکی فلاکت کا تھا، اور دوست دریا نوال اُسکا

افراط جود وکرم سے مانند ید بیضا کے روشن کرنے والا خوش ناموسِ امارت اور ایالت کا بخشش نے اُس کی، دشمنی آسمان کے دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بدطالعی کی پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمرا و دولت کی۔ نشانِ کیوان شان اس فلک جناب کے دار الخلافہ دلی سے بیچ حرکت کے آئے، تو ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری تھے، کہ خود بدولت و اقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گذاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس ناز پروری کے کہ کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے۔ پانچوں ہتیار باندھے ہوئے ایک الایچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ پر سے جاکر آداب بجا لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعرائے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرم جوشی فرماتے۔ چنانچہ راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہلا بھیجا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے موقوف کیا ہے، از بسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں، اور اس تخم ناکاشتنی بے مغز کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں۔" پذیرا نہ ہوا، پھر چوبدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ "تیرا حاضر ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادتِ ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں اُس دن از راہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنائتیں فرمائیں۔ پھر اپنی طبع زاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت و امداد فرمایا۔ سنہ ۱۲۱۱ بارہ سو ایک ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا کی چھوڑ کر اورنگ آرائی کشور بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں ۔

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم	اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں	بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوج غم ہی	ترے در سے معِ لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراق دل جمع	کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم
رہے در پر بتاں کے تم جہاندار	خدا حافظ تمہارا گھر چلے ہم

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بیقرار ہوں میں	ولہ	یہ دیکھ آئینہ ساں چشم انتظار ہوں میں
بسا ہے میرا سراپا جو عطر فتنہ سے		یہ کس کی نرگسِ فتّان سی دو چار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر سے گھبرا کر		مثال ابر بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزۂ گہر جب سے		صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں
ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتو مہر		بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں
ہیں بسکہ جزو تن مرے طاؤس وار داغ	ولہ	رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار داغ
رعنائی تیری دیکھ کے اے سرو باغِ حسن		جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
آتش پہ ہے کہ دل کی جہاندار جوں سپند		جا ہوں جو ٹھہرے، کہ نہیں سکتا قرار داغ

۲۔ جرأت

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعر شیریں کلام ہے۔ ظاہر لفظ امان کا ان کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زمان اکبری سے چلا آتا ہے، اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علم موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمر عزیز کی بیکاری میں بسر ہوئی ہے، اور بے روزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری

کی کرتے تھے، بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم وعالیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارت چشم سے یہ عزیز معذور رہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پھرتا دور دور رہے گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے، لیکن مضمون رنگیں سوجھتا ہے، زبان ریختہ میں صاحبِ دیوان عظیم الشان۔ یہ اُس کا منتخب دیوان ہے +

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا
دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا

ولہ
دن بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟
آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا

ولہ
دل کو اے عشق سوے زلف سیہ فام نہ بھیج
رہزنوں میں تو مسافر کو سرِ شام نہ بھیج

ولہ
روشن ہے اس طرح دلِ ویراں کا داغ، ایک
اُجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

ولہ
میرے ہونے سے تو کچھ گرمیِ بازار نہیں
ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں

دل تو اُمڈے ہے پہ حیرت سے میں کیونکر رو دُوں
ابر تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں

درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار
دہنِ زخم کو گویا لبِ گفتار نہیں

تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی
جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں

ولہ
جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں
کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں

روکے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا
ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں

ولہ
کیا قتلِ دو عالم تو نے جنبش سے اک ابرو کی
اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں
(یعنی قسم کھاتے ہیں)

برنگِ طائرِ تصویر ہیں ہم باغ حیرت میں
کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اُترتے ہیں

ولہ
نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں
آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں

ولہ
اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں
تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ
چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں

کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے
مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو

کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم
کہتے ہو جا کر اُسے بستی کے باہر چھوڑ دو

آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن	ولہ	آتا نہیں اعتبار دل کو
اُسکے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ	ولہ	یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے گویا
جب نہ تب خون مرا ہی پیتا ہے		غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ
تھا یہ جرأت ہی اُس کی کوچہ میں		وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ
جاتے ہیں اُس کو در سے یہ جانا محال ہے	ولہ	جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے
رونے میں اور آتش اُلفت بھڑک اُٹھی		اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے
کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے		سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے
جا بیٹھتے تھے در پہ جو اُس کے وہ دن گئے		اُودھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے
کس کی سنوں بات میں اے مہرباں	ولہ	دھیان تو رہتا ہے تمہارا مجھے
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے	ولہ	ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے
گر کسی ڈھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے	ولہ	غم فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے
شب کو ٹک خواب جو آتا ہی تو ٹک اُسکا خیال		آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے
لخت دل کی مرے یہ اشک رواں میں ہے بہا		برگ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے
گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود		نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے
سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے	ولہ	گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے
دل بھڑکے ہے ٹک مصحف رو جان دکھا دے	ولہ	سرگرم ہے آتش اسے قرآن[۵] دکھا دے
رہنے کی جا جہاں میں ہم خوب پا گئے	ولہ	جوں درد اہل درد کے دل میں سما گئے
ہم گلشن جہاں میں جوں آتشیں انار		اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے
جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے	ولہ	سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اُس کی	ولہ	چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

۵ جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جاوے ۱۲

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے	ولہ	سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اُس دن کو روتے تھے
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی	ولہ	ٹک زلف سے جو رُخ پہ نظر کی تو سحر تھی
ترے بن بستر اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے	ولہ	پڑا روتا ہوں پہروں یار منہ پر آستیں دھر کے

۳۔ جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اُس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظم ریختہ میں نہایت رسا ہے، اور معنی بیگانہ سے بہ شدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار انھوں نے میر درد کا کیا ہے، اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس ایام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں، تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تاکہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا +

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا		قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت		مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا
اس گلشنِ ہستی سے نکل راہ عدم لے		نیرنگ نظر آوے ہے کچھ رنگ یہاں کا
عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا		ملتا ہے پتا نام ہی سے اسکے نشاں کا
اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازار محبت		خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود و زیاں کا
ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا	ولہ	عالم ہے کچھ جدا ہی دل داغدار کا
سر کار بے خودی کا یہ مختار کار ہے		کیا اختیار ہے دل بے اختیار کا
پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ وے		جوشش پڑا ہے درد سر اسکے خمار کا
بزم میں یک شب بھی نرپایا نہ دل گلگیر کا	ولہ	فائدہ اسے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

دمبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے		جوہر ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا
دیکھ کر رنگ صنم تیری جفاکاری کا	ولہ	کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا
چشم پُرآب ہے لب خشک دماغ آشفتہ		زور عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا
مسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور		یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا
جی سیر میں گلزار کی، تن کنج قفس میں	ولہ	یہ صید گرفتار ادھر کا نہ اُدھر کا
گر کوئی کاٹ بھی دے سر ترے دیوانے کا	ولہ	پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا
کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی		شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا
ہاتھ اٹھاتا ہی نہیں یار جو سُلجھانے سے		دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا
سر اُس کی تیغ سے جبتک جُدا نہ ہووے گا	ولہ	کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا
کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھ پر		یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا
دل و جگر پہ ہی آفت نہیں فقط جوشش		جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا

غیروں پہ تو ستم کرے گا	ولہ	ہم پر جو کبھی کرم کرے گا
ہم سا ہی وہ ہوگا سادگی میں		باور جو تری قسم کرے گا
جوشش مت رو دل و جگر کو		کس کا کس کا تو غم کرے گا
دیکھ کر حُسن گلعذاروں کا	ولہ	خانہ ویران ہوا ہزاروں کا
دیکھیں گر اس کی چشم پُرفن کو		ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا
اُس کی آنکھوں کو دیکھیے جوشش		منہ تو دیکھو شراب خواروں کا
ہو چشم حباب وار دیکھا	ولہ	ہستی کو نہ پائدار دیکھا
جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں		دو دل کو نہ بے غبار دیکھا
ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا		بس ہم نے ترا قرار دیکھا
اس ادا کا تری ہوں دیوانا	ولہ	دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش		جی میں آوے ترے تو آجانا
یاں مدعی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا	وله	ہے کوئی جسے تیرا طلبگار نہ دیکھا
سوتوں کو جگایا مرے نالے نے عدم کے		پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا
کل بزم میں سب پر نگہ لطف و کرم تھی		اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش		ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا
کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا	وله	سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے		اپنی ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا
سرگشتہ اس جہاں میں جوں گرد باد ہیں ہم		تھک کر جہاں کہ رہ گئے وہ ہی ہے گھر ہمارا
اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا ظہور میں	وله	کیا بات ہو گئی کہ وہ بیزار ہو گیا
جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا	وله	سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا
نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے		سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا
جب عشق میرا شہرۂ آفاق ہو گیا	وله	اک عالم اُسکے حسن کا مشتاق ہو گیا
کس سے ہوئی ہے دوستی ایسی کہ ان دنوں		آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہو گیا
ہوا ریگ رواں کی طرح جس جا کہ گذرا اپنا	وله	بجز آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا
لگادی دل میں آگ اے آہ سوزاں کیا کیا تو نے		جلادینا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا
شب فرقت ہی بیتابی دل ہی درد پہلو میں		نظر آتا نہیں ہم کو تو بچنا تا سحر اپنا
تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا	وله	ہزار شکر کہیں دردسر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں رہتا ہوں		تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا
تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا	وله	ہم نے کیا جبر اختیار کیا
اُٹھ اے طبیب جا مجھے آرام ہو چکا	وله	مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا
اب بھی کہیں اُٹھاوےگا چہرے سے زلف کو		معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لینا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر		اب میکر اُسکے نامہ و پیغام ہو چکا
تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا	وله	مانند نخل شمع ہر اک اُستخواں جلا
نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا		اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا مکاں جلا
وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا	وله	یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل یہی جگر تھا
غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا	وله	مجھ کو وصال یار میسّر کہاں ہوا
بے طاقت اس قدر یہ دل ناتواں ہوا	وله	حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا
سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں		جلّاد میری جان کا یہ آسماں ہوا
ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا	وله	مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا
کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا	وله	دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا
جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں	وله	یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں

ایک عالم کی جاں خراش ہے یہ	وله	آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ
روئیے تا ہو سبز کشت اُمید		اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ
دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش		بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ
اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے	وله	کہ سدا نیستی کو ہستی ہے
نام سنتے ہو جس کا ویرانہ		وہی سودائیوں کی بستی ہے

جی میں جس وقت کہ مضموں کمر آتا ہے	وله	بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے
چشم تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش		بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے
شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے	وله	ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے

کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے	رباعی	تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے گلے ملے تم		تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے
چشم سے غافل نہ ہوا چاہئے	وله	اس کے مقابل نہ ہوا چاہئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے
اب کہیں مائل نہ ہوا چاہیے

وله

فرہاد یہ بے فائدہ خارا شکنی ہے
گھر کیجئے کس دل میں یہی کوہ کنی ہے

وله

نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مرا دشمن ہے
ایک یہ دل ہے غرض دوست ہے یا دشمن ہے

قطعه

ایک دن کا ماجرا ہے میں اُٹھا تھا سیر کو
دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا ہے سر بازار ہے

برہمن کہتا ہے بت خانے میں ہے ذات خدا
شیخ کہتا ہے غلط کعبہ ہی میں وہ یار ہے

اس میں جوشش بول اُٹھا سنتے ہی شیخ و برہمن
جانے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے

وله

ممکن نہیں کہ دیکھئے روئے شگفتگی
جبتک برنگ غنچہ گریباں نہ پھاڑیئے

وله

جاہ و حشم کی خواہش دولت کی آرزو ہے
دو دن کی زندگانی تس پہ یہ جستجو ہے

صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے
جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے

وله

کہتا ہوں درد دل تو وہ کہتا ہے کیا مجھے
چپ رہیئے بس زیادہ نہ باتیں بنایئے

وله

لاکھوں ہی کئے قتل گنہگار مجھی سے
رہتی ہے مری اک تری تلوار مجھی سے

وله

کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں
دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بند و بست ہے

وله

کشور عشق میں رسوا سر بازار ہوئے
اُس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے

وله

میں آ نہ سکوں اور صبا جا کے رہی ہے
کوچہ میں ترے یار عجب باو بہی ہے

وله

جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے
دل میں تو ہمارے نہ یہی ہے نہ وہی ہے

جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلائق
جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے

وله

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے
مانند شمع حال ہمارا خراب ہے

دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں
جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے

وله

اے عشق مجھے خوار کیا کیا کیا تو نے
رسوا سر بازار کیا کیا کیا تو نے

وله

جس طرح دل کا داغ جلتا ہے
اُس طرح کب چراغ جلتا ہے

وله

اُس رخ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے
آئینہ اپنا ہی منہ دیکھنے لگ جاتا ہے

ہوے صحرا نشیں تشریف لاوے جس کا جی چاہے	ولہ	در و دربان نہیں رکھتے ہیں آوے جس کا جی چاہے
گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے	ولہ	چمن میں کھل جو گئی زلف مشک بو تیری
مرنا تو بہتر ہے جو مر جائیے	ولہ	جی سے کسی کے نہ اتر جائیے
سوئے حرم یا طرف بت کدہ		الغرض اے شیخ جدھر جائیے
نت نئے عذر ہیں نہ آنے کے	ولہ	ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے
قطرے مرے آنسو کے ہیں اک لخت شرر سے	ولہ	کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے
آشنا جب سے ہوئے اس بت ہرجائی سے	ولہ	در بدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے
گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے	رباعی	جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے
جوشش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز امید		یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

باب الحاء

۱- حاتم

حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلی کے تھا، ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میرزا رفیع سودا کا، شاعر خوش بیان تھا صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت خرچ ایہام کیا ہے، اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا۔

گلشن اس گل بن مری نظروں میں ویراں ہو گیا		جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمن جاں ہو گیا
ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف		درد میرا تختۂ مشق طبیباں ہو گیا
اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج		جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہو گیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور		بے نمک آگے ترے لب کے نمکداں ہو گیا
فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں		طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا
سجن نے یاد کر نامہ لکھا اور ہم رہے غافل	ولہ	بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی	ولہ	کہ کہیں سب جہاں وصال ہوا
مثالِ بحر موجیں مارتا ہے	ولہ	لیا ہے میں نے اس جگ سے کنارا
بالے پن سے مجھے سودا ہے ترے گیسو کا	ولہ	بال باندھا ہیاں بندا ہوں ترے گیسو کا
مجھے درکار نہیں مشک و عبیر و صندل	ولہ	ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لوکا
زور چپتا ہے مرے دل کا کبوتر حاتم (بہت غافل)		حیرت کرتا ہے جب اڑتا ہے اسی کے کوکا (خیال)
ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثالِ قند	ولہ	شیریں لبوں کے جب سے بتی بوسے لئے ہیں ہم
ترے رخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں	ولہ	اُدھر بلبل سسکتی ہے اِدھر قمری بلکتی ہے
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہوئے ہم چشمی کے دعوے سے	ولہ	کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے
پری ہم جان کر اس کو چھپائے شیشہ خالی ہیں		یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے
جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	ولہ	تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں
زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چرا کے چلنا		کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں
حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو		کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں
تمہارے غنچہ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں	ولہ	چمن میں سن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں
لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گذرا		شمع رو رو کے ساری رات سرتاپا کھڑی جلیاں

۲- حزیں

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہ جہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے، دلی سے جب جدائی انہوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب بافرہنگ سعید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے انہوں نے ساتھ رعایت نام و ننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں۔

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا — ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ قیامت! ولہ لکھا تھا یوں کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جورِ یار آخر ولہ ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت برا آخر

غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب ولہ دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل

فصلِ گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم ولہ کچھ کر لے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم

رحم آتا ہے مجھے اس مشت خاک اپنی پہ ہائے! خوبرویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم

اس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حُسن نہیں ولہ پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دست رس نہیں

ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں

کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے ولہ دل پہ بیکر وہ اضطراب نہیں

آوے نہ کیونکہ رشک مجھے برگِ پان سے ولہ لیتا ہے کیا مزہ وہ سجن کے لبان سے

نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام، ولہ کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

تو نہ ڈر ٹک اُٹھا نقاب کے تئیں ولہ میں سمبھاؤں[1] گا اضطراب کے تئیں

کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو ولہ کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو

کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گئی سی ولہ کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گذری

خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے ولہ یاں تک کہ ہو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے

کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے

وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سِکھلاتی ولہ تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

حزیں میں درِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے ولہ مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"

مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے" ولہ قیامت شوخ ہے میرا بدگماں ہے

[1] یہ لفظ تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالوں" ہوگا۔

۳- حسرت

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہجہان آباد کے، بیٹا میرزا ابوالخیر کا تھا۔ صاحب قصاید و دیوان ہے، اور سرحلقہ موزونان خوش بیان ہے۔ اکثر نو مشق لکھنؤ کے مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہہ کے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دُکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا، اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ سنہ ۱۲۱۰[1] بارہ سو دس ہجری میں تختہ بند کر کے دُکان وجود کو سیر بازار عدم کی ہے، خدا بخشے اس عاقبت محمود کو۔

اتنا سودا یہ دل زار ہوا، کچھ نہ ہوا
کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا

کاش کے عشق جتاتا نہ میں اُس کو حسرت
میری صورت سے وہ بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا

ولہ
بجا تجھ کو مریض عشق سے ملتے حذر آیا۔
کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھ کو ڈر آیا

ولہ
رقیبوں کے حوالے کر کے خط کو نامہ بر آیا
عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا!

نہیں غنچوں پہ شبنم، اس دہن کے وصف نے انکو
یہ لذت دی کہ پانی مُنہ میں ہر غنچے کے بھر آیا

ولہ
اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جُدا
حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جُدا

ولہ
تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھ کو عجب مشکل
جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل

کرم سے کھول جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے
ترے آگے ہیں سب آساں، اگر آگے ہیں سب مشکل

ولہ
ہوئے ہم بُت کے بندے، برہمن سی راہ کرتے ہیں
حرم کے رہنے والو! تم سی عشق اللہ کرتے ہیں

جلے جوں شمع، اب نزدیک ہے خاموش ہو جاویں
یہ افسانہ سنا کر قصہ ہم کوتاہ کرتے ہیں

ولہ
تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا
کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کو

ولہ
برنگ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے
کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اُسی کو سرگرانی ہے

[1] اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے ۱۲

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے	ولہ	لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے کیا خاک بچی ہے جسے برباد کروگے	
تیرے بن کس طرح پیارے مری اوقات گذریگی	ولہ	ابھی سے دل کو بیتابی ہے کیونکر رات گذریگی	
کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی اُلٹا جو زمانہ ہے تو اس صید نے دل کے	ولہ	جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی صیاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی	
اس زلف میں جا وفات پائی	ولہ	اس دل نے عجب ہی رات پائی	
ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھرے چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے دل درد بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے وہ شکل ہے جیسی دشمنوں میں گھایل	ولہ رباعی	تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے مجھے جو دیکھا تو وہیں ادھر نشان پھرے پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے	

۵۳ حیران

حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے ۔ شاگرد رائے سرب سنگھ دیوانہ تخلص اُستاد کے[1]۔ علمِ شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں ۔ بندش شعر کی ان کے اُستادانہ ہے، استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے ۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن رائے میکو لعل سے کہ مالک واصلباقی کا تھا، توسل رکھتے تھے ۔ بعد رائے مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اُٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا، اور سو سوار کا رسالہ ۔ بالفعل

---

[1] یہ مصرعہ جرأت کی طرف بھی منسوب ہے ۱۲ [2] اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو اُستادِ فن ہیں، حیراں ان کے شاگرد ہیں ۱۲

کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں، اور داد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں ؛

گر یہی وضع ہے، اور یہی ہیہات نصیب! / تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب!
ہم لبِ گور ہوئے خوں بہ جگر اس غم سے / کرنی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب!
صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام / آہ جاگینگے مرے کون سی اب رات نصیب!
کچھ ہمیں شکوہ نہیں جور سے تیرے ہرگز / ہم ہمیشہ سے ہیں اے جان کچھ اوقات نصیب!
مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھراتے حیراں / شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب!

ولہ
ہوا نہ ہم کو کبھی سیرِ باغ و گشت نصیب / کریں گے زیست کا کیا یا وسے ہم زشت نصیب
دلِ ستمزدہ کا آج پوچھتے ہو حال / غمِ فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

ولہ
اپنے جانے کا وہاں دن کو ہے نہ رات کو ڈھب / دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب
دردِ دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا / کل میسر ہوئی حیراں کو ملاقات کڈھب

ولہ
دکھ اُس سے کون کہے، تاب التماس کہاں / کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر، حواس کہاں!
ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط وسے / تمہیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

ولہ
کلیجا بھن گیا، کب تک کروگے ہائے بیدادی / اُٹھوں میں ہی جہاں سے، یا کہ یہ اُٹھ جائے بیدادی

ولہ
کل کہا میں نے "میرے گھر چلیئے / اس میں کچھ کم نہ ہو گی محبوبی"
سُن کے تیوری بدل لگا کہنے / "رسم و راہِ ادب تو سب ڈوبی
مجھ کو کہتا ہے میرے گھر چلیئے / دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۵۔ حسرت

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے۔ شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ چند روز انہوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ

ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے۔ اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں رہی ہے سنہ ۱۱۹۵ گیارہ سو پچانوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے +

رات کا سچ ہوا یہ خواب مرا — دل گیا صبح آفتاب مرا
تیرے کوچہ سے باز نہیں آتا — یہ دل خانماں خراب مرا

ولہ
نہ جانوں کرے کیا حنا کا لگانا — لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا

ولہ
عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا — کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا

ولہ
بسکہ دُکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا — کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا

ولہ
دل ہوا غم میں آب کی سی طرح — پر جلے ہم شراب کی سی طرح
ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے — صبح کو آفتاب کی سی طرح

ولہ
چھپاؤں اشک گلگوں کس طرح ہائے ! — گریباں ہو رہا ہے جابجا سُرخ

ولہ
اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر — یہاں تلک روئے آنکھوں سے دل آوے باہر

ولہ
بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر — دے بگولے کو کہ لے مجنوں کا گھر آباد کر

ولہ
ترے جمال جہاں گیر سے نہ کیوں کر — میں ایک تیرا دیوانہ، ترا ہزار میں دل

ولہ
زلف و رخِ یار دیکھتا ہوں — کیا لیل و نہار دیکھتا ہوں
پھر پیار سے ان دنوں میں بارے — صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

سلہ اس لفظ کو قدما کے لہجے کے موافق بہ وزن نہ پڑھنا چاہئے ورنہ مصرع ناموزون ہوگا ۱۲

ولہ
آپ ہی اپنے یار تھے، جاتا نہیں
غیر میں بھولے تھے پہچانا نہیں

ولہ
ہم نہ ہوں، تو ہو، تو شب چرچا کریں
شمع ہے محفل میں، پروانہ نہیں

ولہ
کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق
اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

ولہ
مر گئے انتظار کے ہاتھوں
کیا کہیں! اپنے یار کے ہاتھوں
پھر مسیحا وہی کرے تو اُٹھیں
سو کہاں روزگار کے ہاتھوں

رباعی
فرہاد سے ہمسری کرے کون
سر کس کا پھرا ہے یوں مری کون
چل کشمکش جہاں سے حسرت
ہوتا رہے نت ورے پرے کون

ولہ
سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشم تر ساون
تو ایک دو دن برس کر ہم سے آ سکتا ہے برساون

ولہ
اُڑا دے اے دوانے! شورش سودا سے ڈر کو
بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہے، پھونک دے گھر کو

ولہ
مجھے افراط رقت میں بجا نہیں بات کر آئی
کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں

ولہ
سُنا ہے آج میخانہ میں جام مے پہ مستوں نے
لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں

ولہ
ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں
اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں
دیکھ اس لب کو ترے، آگ ہیں لعل و یاقوت
تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں
ان پتنگوں کی ہیں جرأت پہ موا جاتا ہوں
بے کلیجے ہیں یہ کمبخت، قہر جلتے ہیں
تو جو مل گرمیاں کرتا ہیگا مجھ سے ہر دم
دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں

ولہ
نہ جی لگا ہو اُس سے جو دردمند نہ ہو
کسی کا دل کسی ظالم کے پا سے بند نہ ہو

ولہ
گو دل بروں کے ماہ سے رخ پر نقاب ہو
پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو

ولہ
لب بام آکے یہ تیرا کھڑے رہنا تو آفت ہے
سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے

ولہ
داغ دل پھر تازگی پہ ہوئے
اب شگوفہ بہار کرتا ہے

ولہ
ترا غرور مرے عجز کے مقابل ہے
اُدھر بہار، اِدھر ایک شیشۂ دل ہے

ولہ
پلا شراب، ہوائے شراب آتی ہے
گھٹا بھی اپنا جھمکڑا کھڑی دکھاتی ہے

لے اُڑا کام اپنا پروانہ
جیسے بھٹکے پھر اکئے حسرت

ولہ

ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے
یار کے دل میں گھر نہ رکھتے تھے

قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد
تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکر دل کی

ولہ

کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے
کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر گئے!

ناصح عبث ملامت، ہیں مبتلا کسو کے
یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے

ولہ

کچھ دل بھی گیا پھرے ہی، پھیرے سو کیا کسو کے
ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے

جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی

ولہ

لگے اُڑنے بھبوکے آہ کے، کیا طرح جینے کی

ناشاد کا میرے حال جیسے نہ گیا
یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا

رباعی

جی تک میں دیا، ملال جی سے نہ گیا
"ہم گئے، پہ ترا خیال جی سے نہ گیا"

زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ
ہوں حسن کی پرستش میں کہوں کیا یارو

رباعی

کہتا ہے کہ "کافر ہے تو اے روئے سیاہ"
آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!

کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہوگا
ہم دونوں میں سیر کرکے دیکھا حسرت

رباعی

صحرا دیکھے گا، جو دوانا ہوگا؛
رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہوگا

میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز

رباعی

زاہد واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی
یہ دختر رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

۶۔ حسن

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہجہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں۔ جو کہ مشہور خواجہ کمہار کر کے تھے چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر، اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں

تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علوم متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں، خصوص علم تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل امورات دنیا میں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان سے ہے، اور زبوں ملاقات تو ایک جان سے ہے۔ بخشی نام ایک رنڈی ارباب نشاط سے ہے، اس پر مرتے ہیں، اور اکثر نام اس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں ؛

حال دل اپنا میں ہر ایک سے کہوا دیکھا
وہاں کسی ڈھب سے پہ ہوتے نہ پذیرا دیکھا

وقت نظارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے
شدتِ گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا، دیکھا

گھورتے ہو مجھے کیا قہر کی آنکھوں سے تم
ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا

دیکھنے سے مرے کاہے کو غضب ہوتے ہو
کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا

تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا
کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا

یہی شورشِ عشق ہے تو الٰہی !
اس آغاز کا کیوں کہ انجام ہوگا

رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں
تو صیاد ! ٹکڑے ترا دام ہوگا

سوئے ہم تو، پر بے قراری وہی ہے
خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا

اگر نزع سے جان بخشی حسن کو
تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

ولہ

جو بندہ خانے میں آئیے گا، فقیر تم کو دعا کریگا
کسی کے دل کو جو خوش کرو گی، خدا تمہارا بھلا کریگا

ولہ

عالم اس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا
پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا

ولہ

پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا
یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا

ولہ

دل و لاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر
خانۂ ماتم میں ہو پرسے سے زاری بیشتر

ولہ

بھلا میں دوانہ سہی، پر یہ ناصح
مرے ساتھ بکتا ہے، عاقل کو دیکھو

یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ میں تم
چلو راہ رو، اپنی منزل کو دیکھو

ولہ

ٹک جلا دے ہمیں گویا ہوتا
اے لبِ یار مسیحا ہوتا

میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں | پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا
مانوں تب وعدۂ فردا اے یار | جب ترے وعدے کو فردا ہوتا
اے مرے اشک سر مژگاں پر | قطرہ کیا ہووے ہے دریا ہوتا
تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو | عین خلوت میں اکیلا ہوتا
سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھ | موند لے آنکھ کو تنہا ہوتا

ولہ
چلنے سے کب اشک ہارتا ہے | دریا ہے کہ جوش مارتا ہے

ولہ
آ کربلا سے قتل ہی کر جائیے مجھے | صورت اسی بہانہ سے دکھلائیے مجھے

ولہ
غم نے ایذا جو اے صنم بخشی | یہ بھی سرکار کی کرم بخشی

ولہ
حقیقت کہیں کیا ہم اس انجمن کی | نہ تھی وہاں خبر اپنے ہی تن بدن کی
اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے | تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

ولہ
یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی | یہاں دل جلایا، اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی
کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں | موجب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی
کچھ اور تو ہوا نہیں ہی ساری عمر میں | تقصیر یہ ہوئی، کہ میں تقصیر کچھ نہ کی
مرتا ہی جاں کنی میں حسن حیف! تم نے رات | اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

ولہ
ٹک اپنا یہ رونے پہ اگر دھیان لگاوے | ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگاوے
شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی، جو چاہے | اور سنگ سی سرمہ کے ذرا سان لگاوے
دن رات مری تجھ سے دعا ہے یہی یارب! | اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگاوے

ولہ
کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے رہے | پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے
ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی | بے سبب اب آپ جو ادھر کے آنے سی رہے
آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار | اور تو سب یکطرف، منہ بھی دکھانے سی رہے
اُس نے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر | دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۱۷۔ حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد ہی میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے نواب سالار جنگ اور خلف ان کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہی اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچ مدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے، اور ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔
یہ اشعار منتخب دیوان ان کو کردار کے ہیں +

گر کیجیے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا
تو چاہیے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا

ولہ
چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا
اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا

ولہ
نہ تھی تھمتی آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو
حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا

ولہ
ایسی ہی آہ! باتیں اس بیوفا نے چھیڑیں
روتے ہی روتے جس میں روز وصال گذرا

ولہ
کچھ تو صدا ہو آہ! نہ خاک بھی، کہ جو
اُدھر کو لگ رہا ہے حسن گوش نقش پا

ولہ
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا
جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

ولہ
چھوڑ دے کوئی کسی کیلئے جس طرح سے کچھ
ہم نے منت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا

ولہ
اپنی جاگہ نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا
تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا

ولہ
وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا،
سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا

ولہ
دامن صحرا سے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں
پانوں دیوانے نے پھیلایا، بیاباں دیکھ کر

مصرع اول		مصرع ثانی
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا	وله	ہو چکی وہاں بہار ہی آخر
اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر	وله	جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر
دیکھا جو وہاں اُس کو، گماں سو طرف گیا	وله	آئے نہ ہوتے کاش کہ ہم کوئی یار تک
آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم	وله	شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم
اس کی جب بزم سے ہم ہو کے بہ تنگ آتے ہیں	وله	اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوئے جنگ آتے ہیں
حُسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوے کون		شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں
اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں	وله	ہو گر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں
ترے بن باغ میں جس وقت غنچے دل کے کھلتے ہیں	وله	خراش ناخن غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم!		ذرا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں
ہے سزا دل کی جو زلفوں کے گیا پھیرے میں	وله	شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پھیرے میں
کہتا ہی تو کہ ”تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں“	وله	تو بھی کہیں ہو سچا میں یوں ہی چاہتا ہوں
مجھ پر ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں،	وله	لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں
روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن		یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں
صیاد کی مرضی ہی یہ اب گل کی ہوس میں	وله	نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں
وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی اُلفت		ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں
دم رُکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے		عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تار نفس میں
دل اپنا اسی باتوں سے اُٹھ جاتا ہی تجھ سے		جا بیٹھے ہی تو لے کے جو ہر ناکس و کس میں
تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہی کہیں	وله	جی دھڑک جاتا ہی میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو
غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو	وله	کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت		شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو
کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گذرتی	وله	پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گذرتی

جان و دل ہیں اُداس سے میرے	ولہ	اُٹھ گیا کون پاس سے میرے
ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو	ولہ	میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے
کیا چھپ کے پوچھے ہے کہ "گھر تیرا نہیں ہے"	ولہ	کہنے کو تو گھر یہاں ہے، پہ جی اپنا وہیں ہے
سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیئے	ولہ	تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیئے
جب میں چلتا ہوں ترے کوچہ سے گھبرا کے کبھی		دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "ادھر کو چلیئے"
نغمۂ عشق سے ہیں سبحہ و زنّار ملے	ولہ	ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے
دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گذرے		مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے
جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملیئے گا کبھو،		پر ترے ہنس کے لپٹ جانے میں ناچار ملے
گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجئے	ولہ	سایہ میں اُس کی زلف کے آرام کیجئے
اب میں بھی بے قراری پر اپنی لیا قرار		بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجئے
بھولے سے نام لے کے مراہٹ بتا گیا	ولہ	پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی
کئی دن ترے چپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے	ولہ	نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے
ترا ہر چند دل تجھ سے کبھی کچھ سخت ترسا ہے	ولہ	ولیکن سخت اگر کہیئے، تو کب میرے جگر سا ہے
گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے		"کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوار در سا ہے"
رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی	ولہ	کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھوئیں عبث بھرم بھی
دریا میں ڈوب جائیے، کہ یا چاہ میں پڑے	ولہ	اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے
آجا کہیں شتاب! کہ مانندِ نقشِ پا		تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے
یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بُری لگے	ولہ	تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غُربا کو بُری لگے
کیا ہنسنے اب کوئی اور کیا رو سکے	ولہ	دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا،	ولہ	بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گذرے
آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو ہستی نظر پڑی	ولہ	پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہاں خراب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر		بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی
جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیئے	وله	انصاف کر تو، چاہیئے یہ یا نہ چاہیئے
مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں		تجھسا جو مجھ کو چاہے، تو پھر کیا نہ چاہیئے
مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکو	وله	رہتے ہیں ہم دوانے روز ازل سے تنکے (یعنی اُن کے)

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں	رباعی	چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح		سویا کرتے ہیں عین بیداری میں
ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے	رباعی	ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو؟		اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد۔

نہیں یہ لکھنؤ، ہے یہ زمانا	زمانے پر عبث رکھنا بہانا
زبس یہ ملک سے ہنچر یہ بستا	کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں	کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ ہیں
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم	سما سکتا نہیں ہی غیر کا دم
سیہ گِل سے گلی یوں تر رہے ہی	بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہی	ہر اک گھر بخل کا سا دل یہاں ہی
کنواں بھی یوں ہے پھر اس تنگ گھر میں	پڑے پُتلی کا تل جیسے نظر میں
کنواں کہنا اسے ہے عقل سے دور	کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور
کہوں کیا میں قدامت اس مکاں کی	پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی
ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ	ولیکن مثل زلف زشت رو، پیچ
جو اس کے زیر سایہ آن نکلے	رُکے دم، اور اُس کی جان نکلے
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر	پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے
بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے

زمیں کونے سے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے

چڑھے ہے گومتی جب گرد آکر
حباب آسا بہے پھرتے ہیں سب گھر

رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں
چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں

سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

چلا میں یہاں سے دل اپنا اُٹھا کر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر

عجب معمورۂ آباد پایا
مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

کھلا بازار اور رستہ کشادہ
بیاضِ جدولی جیسے ہو سادہ

دو رستہ راستے میں اتنا رستا
کسی نے آج تک دیکھا ہی بستا

وہ جی ہے شہر کا تر پولیا یوں
کہ جیسے تین رُوحیں جسم میں ہوں

ادھر کو جوہری، اُدھر کو بزّاز
ادھر صرّاف، اور اُدھر طلاساز

روپے اور اشرفی دیکھے برستے
دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے

یہ فرنی اور فالودے کا عالم
(یعنے فرنی)
کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم

ملا شربت میں جو اُس کو بتاوے
شب مہ کا سما پانی میں پاوے

ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا
اُسی میں مال حلوائی نے کھویا

بلندی پر ہے حلوائی کی دُکاں
ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں

دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسے
کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے

مٹھائی کی کروں تعریف تا چند
قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند

ھزاروں خانگی اور کسبی آکر
کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر

چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے
کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے

وہ سبزہ کان میں زیبِ بناگوش
کہ جس کو دیکھ طوطی کے اُڑیں ہوش

شعاع اس کی یہ اور منہ کا پسینا	ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کُرتی پہن جالی کی سادہ	گریباں کر کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید	سحر کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے	نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

بابُ الخاء

۱۔ خاکسار

خاکسار تخلص، محمد یار نام، شاہ جہان آبادی۔ قدم شریف کے خادموں میں سے تھا، بڑا ہی مشاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھوک کرتا رہا ہے، اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحبِ دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں"۔ یہ اشعار طبع زاد اس کہن اُستاد کے ہیں +

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہِ کنعان عزیز	ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اُس دشمن دیں کافر نے	بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز
کیوں نہ وہ مصحف رو جان سے مجھ ہووے زیادہ	کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز
خاکسار عشق[1] سے بھی دیکھا پرے تیرا مزاج	آپ میں آ ذرا، اپنے تئیں پہچان عزیز

دل شیفتہ کر کے کیا لیا تو	ولہ	اے خانہ خراب! کیا کیا تو
تیری زلف سیہ سے اے پیارے	ولہ	مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
قیامت بھی ہو گی تو میری بلا سے	ولہ	مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

[1] تقطیع میں عین گرتا ہے ۱۲

روتے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی	ولہ	اس خانماں خراب کو جیتا خدا کرے!
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے	ولہ	آہ! جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سی

بَابُ الدَّالْ

ا۔ درد

درد تخلص، خواجہ میر نام۔ متوطن شاہ جہان آباد کے، خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے۔ ثابت قدمی میں اس قطبِ آسمانِ استقلال کی، اور زاویہ گزینی میں اس مرکزِ دائرۂ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور رہے، اور زبان زد جمہور رہے، کہ جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے اور کثرت منتخبان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنت النعیم تھا، تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ تھا۔ جبکہ متواتر نزولِ آفات کے باعث، اور مکرر ورودِ بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صابرِ زاویہ گزین نے، اور ہر توانگرِ بالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سید والا تبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اُس قطبِ آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہ تحمل کو دیکھتا، تو چاشنیٔ فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار بیچ اس عرصہ کے ہوتا، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفاتِ طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے ہے بلکہ واسطے گرمانے افسردہ دلانِ خام کے ہے۔ اُس شہسوار معرکۂ سخنوری کے توسنِ تند خرام قلم نے بیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی، اور اُس یکہ تاز عرصۂ مضمون

تراشی کے ست رنگ آسمان سیغامہ سے ہیچ میدان بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی تعجب نہیں ہے اگر اُس عندلیب گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحہ کاغذ کا ہمرنگ برنگ گل ہو، اور نغمہ زبان قلم کا ہم آہنگ صفیر بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد واثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسایل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے، اور شرح بھی اُس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنمائے کامل تھے بسنہ ۱۲۰۲ بارہ سو دو ہجری میں اُس بلبل گلشن آزاد نے دام ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمن عدم کے آباد کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے:

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا
حقا کہ خداوند ہے تو لوح وقلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن
آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر وحرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی
کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

ولہ
اہل زمانہ آگے بھی تھے، اور زمانہ تھا
پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل پہ عنقریب
معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

ولہ
یک بیک نام لے اُٹھا میرا
جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

ولہ
گل و گلزار خوش نہیں آتا
باغ بے یار خوش نہیں آتا

ولہ
جاں پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا
جی نہ رہے یا رہے، مجھ کو اُدھر دیکھنا
ذکر وفا کیجیئے اُس سے کہ واقف نہ ہو
کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو ادھر دیکھنا

ولہ
باہر نہ آسکی تو قید خودی سے اپنی
اے عقل بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یہاں
جی میں سما رہا ہے ازبس غرور تیرا

ولہ
ہم نے چاہا بھی، پر اُس کوچہ سے آیا نہ گیا
وہاں سے جو نقش قدم دل کو اُٹھایا نہ گیا

ولہ
چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشم تر شبنم
بہار باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

تیری خون آشامیاں مشہور ہیں ای تیغ یار		ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو
اس ہستیِ خراب سے کیا کام تھا ہمیں	ولہ	اے نشۂ ظہور یہ تیری ترنگ ہے
نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے	ولہ	کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جاوے		کہ زندگانی عبارت ہی تیرے جینے کی
جو ملتا ہے مل، اچھے کہاں زندگانی	ولہ	کہاں ہیں، کہاں تو، کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو		سنا لوٹک اب اپنی کہانی

۲- دردمند

دردمند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن ان کے بزرگوں کا وطن ہے، بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خدمت سے میرزا جان جانان مظہر کی کیفیت آدابِ فقر کی اُٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے۔ چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے، اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلی گئے، اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بُلائے ہوئے شاہ جہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہیں ٹھرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر ۱۱۷۶ھ گیارہ سو چھہتر ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے، اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے، اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے +

پڑی اُس کی خوبی کی ازبسکہ دھوم	لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی! اے جانِ فصلِ بہار!	یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار
ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی؟	فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

ملہ اس مضمون کو شیخ ابراہیم ذوقؔ نے اس طرح باندھا ہے۔ کہے ہے اس سے دمِ ذبح یہ گلو میرا۔ کمی کی وجہ سے کرے تو پیئے لہو میرا۔ لیکن دردؔ کی بندش کو نہیں پہنچا ۱۲

تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں
سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں

مری عقل میں کون اسناز ہے
ارسطو مرا اک دوا ساز ہے

فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار
نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روبکار

نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف
شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف

چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک
کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک

تجھے جان گل کے لہو کی قسم
تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم

تجھے جام کے چشم تر کی قسم
تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم

ادا سے لہکنے کی تجھ کو قسم
نشہ سے بہکنے کی تجھ کو قسم

تجھے جام صہبا کے سر کی قسم
تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم

تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم
تجھے خود پرستی کی اپنے قسم

قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی
قسم ہے مرے نام کے ننگ کی

ارے بے وفا بے مروّت صنم
میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم

تجھے دخترِ رز کی حرمت کی سوں
تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں

تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں
تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں

تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں
تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں

شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں
تجھے اپنی مہندی کے پاؤں کی سوں

جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام
تو اتنا کر اے ظالموں کے امام

کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال
مرے خون کو اپنے اوپر حلال

تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں
مگر جینا میرا بھاتا نہیں

نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا
زیاں خوب نیں اپنی سرکار کا

یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن
تری مہربانی کا مجھ کو گمان

تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات	نکل جائے جی ناامیدی کی ساتھ

رباعی

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد	اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر	سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

۳- دل

دل تخلص ، شیخ محمد عابد نام - متوطن بلدہ عظیم آباد کے بے مثل ، اور بے نظیر عالم محبت و وداد کے شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں ، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر بیان میں آئی ہیں - غرض دونوں بھائی سنجیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں ، طریقہ یک رنگی میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اُس اہل دل کی تلاش سے ہیں[۱] -

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی	نقد جاں لیجئے حاضر ہے گنہگاری دل
نالے ہی سدا بھر بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی	برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

۴- دیوانہ

دیوانہ تخلص ، رائے سُرب سُکھ نام ، رشتہ دار راجہ مہا نراین کا تھا - نہایت پرگو - اور وضع مغلیت پر مرتا تھا - دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں ، اور اکثر ریختہ گو - لکھنؤ کے ، مرزا جعفر علی حسرت ، اور میر حیدر علی حیراں ، اس کے شاگردوں میں سے ہیں سنہ ۱۲۰۱ھ بارہ سو

[۱] اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخے سے ہم نے نقل کیا ہے اُس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے یہ مندرجہ بالا چار شعر ہم نے سخن شعرا ، مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ سے نقل کیے ہیں -

چار ہجری میں لاچار گرم روی راہِ عدم میں کی، اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبعزاد ہے ؛

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے و لے
گرمیٔ بزم کہاں اُس بتِ عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اُس یار بغیر

ولہ

دل ہے کہ تری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے
رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا اچھل نہ جائے

رباعی

وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے
وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

بابُ السّین

۱۔ سَودَا

نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس شاہبازِ عرش پرواز معنی کا مرزا رفیع ہے بمتوطن دارالخلافہ شاہجہان آباد کے۔ بیشک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دِلّی میں ساتھ کمال عزو وقار کے رہے، اور طبع رسا کی مربی گری سے انیس و جلیس سلاطینِ نامدار اور روز رائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ

لے مصنف نے جس خاص استعاروں میں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے انتقال کو بیان کیا ہے، اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی فراخدلی پر شعر ہیں ؛

ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا لکھا چاہیئے، اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیات معانی کے، بیان کو ان اوراق پریشان کے، زیب وزینت دیا چاہیئے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزائے مذکور سرحلقۂ سخنوران اور سرآمدِ معنی گستران تھے۔ آشنائے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلعِ دیوان سحر بیان کا بھرا ہے، اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور وشور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرز قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کرکے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہم نازک خیالانِ ہندستان کا اس کے خیال تک نہ جاسکا۔ آگ گویا میں اُس آتش زبان کے ہجوم شرار سے جوشِ قطراتِ عرقِ انفعال ہے، اور پانی کو خجالت سے اس طبع روان کی خاک میں چھپنے کا خیال زبان ہندی شرفِ ہمزبانی سے اُس کی سرفراز، اور نظم ریختہ کو طبع معنی آفرین پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل وحرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا، تو اَور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طورِ سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر ومنزلت کی، اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں، اور کیا کیا تر وتازگی کے ساتھ مضامینِ عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سنِ شریف اس خضرِ راہِ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا، تو داعیِ اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفل نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے، لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستون مضمون تراشی کے سنگ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے ✦

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے	فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد	شاعرانِ ہند کا سرور گیا

آغا باقر کا امام باڑہ اس محبِ امام علیہ السلام کا مدفن ہے، سایۂ قدومِ امام کے باعث

بیشک رنج مکافات کے واسطے مامن ہے۔ یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں
اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں +

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
کہ ہو جو تیغ بے جوہر اسے ہے ننگ عریانی

خوش آمد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی

کرے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

یہ روشن ہے بہ رنگ شمع ربط باد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست، ہے وہ دشمن جانی

ولہ

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک

بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب
ہے کسوت کبود گل زعفراں تلک

لاف سپہ گری نہ بکے مرد راست باز
پاوے نہ راہ حرف زبان سناں تلک

سختی سے گذری اہل سعادت کی یہاں معاش
ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

مطلع ثانی

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک
آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک

وہ مرغ ناتواں ہوں کہ صحن چمن سے میں
بے نردبان پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک

روضہ میں جن کے حلقۂ چشم ملک سوا
پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک

ہنگام طوف بسکہ ملائک ہمیشہ وہاں
لیتے ہیں خاک ان کے اس آستاں تلک

خادم کہے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر
پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک

رہنے کو جگ میں صورت افسوس کے تئیں
احکام خورمی نے کیا منع یہاں تلک

انگشت چوسنے کے لئے طفل شیرخوار
ممکن نہیں کہ لاسکے اپنے وہاں تلک

اس چرخ دوں پرست تلے بہر شست جو
مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک



قصیدہ

ہے سخن سنج اک جوانِ متیں
فخر صائب جو وہ کرے تحسیں

رات جا کر میں اس کی خدمت میں
اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
مل کے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں اُن سے اب زمانے میں
بزم شعرا سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

مثل شیرازۂ کتاب اللہ
سمجھے ہر ایک اپنی چینِ جبیں

تنگ جانیں جو بزم کا اُن کی
بوعلی ہو صفِ نعال نشیں

اور جو احمق اُن کے سامع ہیں
دم بہ دم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے سُبحانَ مَن یَرانی پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمیں

شعر و تقطیع اُن کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
پیچِ در کونِ آسمان و زمیں

غرض اس خبث کے تئیں سُن کر
ہو کے بے اختیار میں وہیں

کہا سودا کو اُن بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہی کیے آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا پھبے ہے اُسکے تئیں

ہے وہ مداح ایک ایسے کا
مسند جاہ جس کی عرش بریں

یعنی نواب سیف دولہ اسد
جس کی شمشیر و فرق دشمن دیں

رفعتِ دستِ جود سے جس کے
دامن خلق کا ہے یہ آئیں

پنجۂ آفتاب کی سی طرح
بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں

غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
تیری بخشش نے مشتِ زر کی تئیں

دست و پا اپنے گم کرے ہی عدو
یاد کر تیری تیغ و خنجر کیں

پوچھتا ہے ہر ایک سے سچ کہہ
سر سرا شنگریوں میں ہی کہ نہیں

فکر میں قہر کے ترے ہر شب
حالت نزع سے زمیں ہی قریں

نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں
جاے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکہ کام تیر
ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر

اتنا ہی چست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چست
خوبی کا حق کرے ہے ادا یہاں تمام تیر

ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ
انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے

کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے میں کئی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے

ثابت ہے جو ڈگلا تو نہیں موزوں میں کچھ جا
تیروں میں ہی پر گیری تو بے چلہ کماں ہے

کہتا ہے نفر غرّہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کھایا ہے یہ فاقہ سے میاں ہے

یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے

اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے

لیتے ہیں بایں روسیہی دہ تو دو ماہہ
تک دھوس دھڑکے کی جنہیں تاب و تواں ہے

قاضی کی جو سمجھ ہو گدھا باندھ کے اُس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملّا جو اذاں دیوے تو منہ موند کر اُس کا
کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے

بولا جو خطیب اس میں تو مارے اُسی اک ہول
ملتفت آگیا واعظ تو تھپیڑا یہ وہاں ہے

رینگے ہی گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نہ ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

اور وہ جو ہیں کمزور سو واں آن کے بیٹھو
رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دُکاں ہے

اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں انہیں حال وہ اپنا
دربار رَوا اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے

یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پال کے آگے
اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے

کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک
کوئی روئے ہی منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے

ہندو و مسلماں کو پھر اُس پال کے اوپر
ارتھی کا تو ہم سے جنازے کا گماں ہے

یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحب ارتھی
کرتا ہی جو وہاں عرض تو نہ یہاں ہی نہ وہاں ہے

گو ہو جئے جا کر کسی عہدے کے صاحب
اُس کی تو اذیت بڑی ہی آفتِ جاں ہے

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دوزانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خوابِ گراں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہی اور چرت اوپر چرت
منہ صورتِ سوفار کمر شکلِ کماں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کی تئیں چھینک
آوے تو وہ اُس کو بہ خشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

سوداگری کیجے تو ہی اُس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ یہ دمڑی کا گماں ہے

گر خان و خوانین کی کرے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ پہ عیاں ہے

ہر گھر میں وہ چلا ہے کہیں فوارہ سا چھوٹوں
ہر کوچہ میں جوں آب چکاں بادرواں ہے

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا
زینت قطعۂ تہنیتِ خان زماں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے

اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ اس کا
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

ملائی اگر کیجیے تو ملا کی ہے یہ قدر
ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے

دن کو تو وہ بیچارہ پڑھایا کرے لڑکے
سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے

تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اس کے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت
چھٹتے ہی تو شغل کرے وہ مطعون زباں ہے

دیتا ہے وہ مخرس سر کوئی شملہ کو نسبت
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر
ہے آج کدھر عرس کی شب وز کہاں ہے

تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی
لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجو اسپ بخیل

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو ٹکاتے ہیں وہ ادھار

تنہا دلے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خستے لئے اکثروں میں اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پا دے سزا جواں کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

ناطاقتی سے اس کی کہاں تک بیاں کروں
فاقوں کا اس کے ہائے کہاں تک کروں شمار

اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھ کو کب کروگے یاد — اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چار

جس دن سے اُس قصائی کے کھونٹی بندھا ہے — گذری ہے اس نمط اُسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر — دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

خط شعاع کو سمجھے ہے وہ دستۂ گیاہ — ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا — چوکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ تھاں کی طرف — کھاتا ہے دانہ گھاس کی جاگہ سدا بچار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی — گھوڑے کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اُس کے پیٹ میں — دھونکے ہے اپنی دُم کو کہ جوں کھال کو لُہار

پیدا ہوئی ہے تس پہ اگن پاؤ اس قدر — ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جس طرف سے کبھو اُس طرف سے — باد سموم ہووے صبا گر کرے گذار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سُرنگ — خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں — کہتے ہیں اُس کے رنگ کو کسی ہیں اعتبار

یہ حال اُس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق — چنگل سے موذی کی تو چھڑا اُس کو کردگار

یا مر رہے یا چورے جاوے یا ہووے گم — اس تین بات سے کوئی بھی ہووے آشکار

تنہا نہ اُس کے غم سے ہے دل تنگ زیں — خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور — آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضارا وہ آشنا — مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں اُن کے میں نے کیا جا کے التماس — گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب اُنہوں نے کہ اے میری جان من — ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ — یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ — سیرت سے جس کی نت ہے سگ خشمگیں کو عار

بدرنگ جیسے لید ہے بدرنگ جوں پشاب
بد یمن اس قدر کہ کرے اصطبل اجاڑ

مانند سیخ چوکی لکدزن سے ہے تھان پہ
لاجنبش بے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہے اس قدر کہ قیامت کرے ہے اوپر
دجال منہ کو اپنے سیہ کرکے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہے کہ سب اگ گئی ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلا دے اس کا سن
پہلے وہ ملے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھے ز روئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا دے کبھی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

مدّعا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار

دلّی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا ہیں اس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھوں میں پکڑی تھا منہ میں باگ
لہو میخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبرا اسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ ستی جوں میخ استوار

اس ضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبر ان میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیچھے اسے لگا کے کرتا ہووے یہ روا
یا بادبان باندھ ہو سنکے وہ اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بڑ کو ہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی تجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

کہنے لگا یہ آکے اُس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈاین چلے ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے وہاں دوچار

دھوبی کمار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گذار

ہر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دُم کمار

دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبے خفت سے یک کنار

بدپشمی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی تو چندہ ایتوار

رکھتا کوئی تھا لا کے سپاری کو منہ کی بیچ
لیتا تھا کوئی دوڑ کے موتن مستی اُتار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کی گرد و پیش
ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑی کو لگی
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن سے پار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار

یہ کہ کے حق تئی میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹہ فی ہوا مجھ سے بھی دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پہ
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفل نے سوار

جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بندھی یہ شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

✤

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے درِ دل سے اُٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے ای شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہی بتاں کا

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن		جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو		مضمون یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا
جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا	ولہ	مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا
جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا	ولہ	ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں		رحم اے آہ شرر بار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہت گُل		پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۲- سوز

سوز تخلص ہے، سید میر نام، ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سید عالی نسب، اور فن سخنوری میں اُستاد، طرز ادا بندی کے بادشاہ، اور صورتِ مضمون درد واہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرز خاص تھے، اور آئین محبت میں مایۂ مؤدت و اخلاص۔ علم تیر اندازی اور کماں داری میں بہ شدت دل آشنا رکھتے تھے، اور حُسنِ شفیعہ نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں انہوں نے ساتھ کامِ دل کے ایام زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارھویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے۔

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشد آباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، اور اس دارِ فنا سے راہی ملکِ بقا کے ہوئے۔

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرۂ نثر لکھ کر مجھے بھجوائے تا کہ داخل تذکرہ کروں"۔ چنانچہ ایک

آوہ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اُس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے "کہ جو شے حق سبحانہ تعالی نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار وخس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوزؔ وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سواء سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے۔ پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے۔" غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں۔

اہلِ ایماں سوزؔ کو کہتے ہیں کافر ہو گیا
آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا

ولہ

درد سے محروم ہوں درماں سے مجھ کو کام کیا
یارِ خاطر تھا سو میرا بارِ خاطر ہو گیا

میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہے بے سرِ نام
واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہو گیا

کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں ای صنم
بات کے کہتے ہی دیکھو سوزؔ شاعر ہو گیا

ولہ

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا
ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا

قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے
پر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا

پھر بھی کہتا ہوں تجھے "آ سوزؔ کو یوں مت ستا"
مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائیگا

ولہ

مُندی گر چشم ظاہر دیدہ بیدار ہو پیدا
در و دیوار سے شکل جمالِ یار ہو پیدا

تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر
کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا

یہاں تک کفر پورا چاہئے گر خاک گلشن ہو
بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا

قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں، کیا یہ بھی تعجب ہے
کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا

مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوزؔ کو ڈر ہے
جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

ولہ

جی تاک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا
جینا تو الٰہی مرے کچھ کام نہ آیا

دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جاں
جبتک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تری جاں لب آیا
قاصد سحر تو پوچھا تھا کہ قاصد ہو تو کس کا
تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کے لب پر
کھڑے رہنے والو مگر سوز ہے یہ
مرا کشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر

رحمت ہے خدا کی تو لب بام نہ آیا
وحشت ہے اُسے یاد مرا نام نہ آیا
جی ناک میں آیا، بت گل فام نہ آیا
ولہ
بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا
یہ خورشید پھاڑے گریبان نکلا

قتل سے یہ بے گنہ راضی ہیں اپنے اس لئے
ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا
درگذر اس خوں سے آخر پھر تجھے آویگا رحم
کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
زلفوں سے بڑا طول ہیں اب عشق کا جھگڑا

ولہ
ہاتھ میں اک روز تو دامان قاتل ہووے گا
کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہووے گا
سوز کا دل جس گھڑی خنجر سے بسمل ہووے گا
ولہ
جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا
خط آن کے یہ مجملہ کوتاہ کرے گا

اپنے رونے سے گر اثر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر
خون عشاق کرتے کیوں ناحق
سوز کو شوق کعبہ جائیگا

ولہ
قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
حال میرے سے باخبر ہوتا
گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اس کے کبھو اپنا
خدایا کس کے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو

ولہ
تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
ولے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خود نمائی کا

قاضی ہزار طرح کے قصوں میں آسکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بار ہا ولے

ولہ
لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا

کیا فائدہ ہی رونے سے اے چشم زار بس — کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے گو پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا — اُس کو سراہیئے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث — تو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آسکا

ولہ
خطرہ نہیں ہی مجھ کو اے عشق اپنے جی کا — تو نے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح مُنہ چڑھے ہی اُس تند خو کے اُٹھ کر — کیا آہنی کلیجہ دیکھو ہے آرسی کا
کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سی تو باز آ — دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اُس کی ڈہڈہاہٹ — پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا — اے سوز کس کو دعویٰ ہی تجھ سی ہمسری کا

ولہ
تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا — ایک باری تو سُن افسانہ رنگیں میرا
بوئے گل شاخ ہوا میں سی بھی لیتا ہی پہن — کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا

ولہ
زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا — یہاں تک تو پریشان یہ دلِ زار نہ ہوتا
خو گر جو دوا سے طبیب اپنے کو پایا — تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
گر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جا کر — تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا

ولہ
ایک دن اک شخص نے اُس سی کہا — تو نے تو یہ ذکر سُنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا جی سی سوز — ہو مُتبسم یہ کہا ہوئے گا

ولہ
بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا — دو آنکھ موند ہم وہ من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر — عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے میرے کیا فائدہ کسی کو — دیکھا اُنہیں نے مجھ کو جن نے سخن میں دیکھا

ولہ
اس سوا کھوج نہ پایا ترے دیوانے کا — قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا

ولہ
کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا — مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈی گا — جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا
رہے گا مرگ کے بعد از مزار میں رونا

ولہ

جو چھپ کے رات کو شبنم چمن میں روئے تو کیا
مجھے تو ایک سے لے تا ہزار میں رونا

نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی
خزاں میں خاک ہے سر پہ بہار میں رونا

تو روز وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ
ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

ولہ

بتوں کے عشق سی واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا
اُنہوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

ولہ

جس نے آدم کے تئیں دم بخشا
اُس نے مجھ کو دلِ پر غم بخشا

ساغر عیش دیا اَوروں کو
سوز کو دیدۂ پُر نم بخشا

ولہ

جس نے ہر ذرہ کو درماں بخشا
مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا

بے نیازی تو میاں کی دیکھو
گل کو بھی چاک گریباں بخشا

چشم معشوق کو دی عیاری
سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

ولہ

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا
پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا

ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ
مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آجاؤں گا

اس طرح جی دوں کہ تو رحم سی بولے صد حیف
رسم عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا

باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا
آشیاں آتشِ گل سے میں جلا جاؤں گا

لے چکا دل کو خطا اب جان جو مانگے ہے خیال
سوز کہتا ہے یہ گولی تو بچا جاؤں گا

ولہ

گل ہی نہیں غلام تبسم کی آن کا
غنچہ بھی زر خرید ہے تیرے دہان کا

زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلے ہوا ہے خم
بھٹتا ہے ایسے چلوں سے چلہ کمان کا

سینہ میں دل کہاں ہے غم رفتگاں سی سوز
اخگر یہ رہ گیا ہے نشاں کاروان کا

ولہ

جو دل کہ تھا الہیٰ اُس دلربا کے گھر سا
خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا

ترسا نے ترس کھایا احوال سن کے میرا
بے ترس ڈر خدا سے اتنا نہ مجھ کو ترسا

شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی
خورشید کی کُلہ پر کچھ تو دھرا ہے پرسا

جاتا ہی سوز جس دن کہتا ہی ہمنشیں سے
آنے نہ دیجو اس کو لگتا ہے بد نظر سا

ولہ

مروت دشمنا غفلت پناہا
ادھر ٹک دیکھ لیجو مرتے کے آہا

صرفت العمر فی لہو ولعب
فآہا ثم آہا ثم آہا

یوں دیکھ لے ہی وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر
چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر

عشاق تیری تیغ تلے او ستم پناہ
سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر

رخصت جو دی تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا
بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر

ناصح تو چاک جیب کا مانع ہی اس قدر
دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر

ولہ

اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط
سچ تو ہے ان بے وفاؤں سی کہاں کا اختلاط

اب کوئی دم کو مچاوے گی خزاں یاں آ کر دھوم
عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط

ولہ

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا
نہ دیکھوں جبتلک آنکھوں سی کچھ باور نہیں آتا

پرائے دل کو لے کر اپنے تلوؤں کے تلے ملنا
ا بے سُن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا

کسی کے دل میں ہوگا سوز مر جاوے تو بہتر ہے
الٰہی میں مروں کیوں کر مجھی تو مر نہیں آتا

ولہ

کیا دید کروں میں اس جہاں کا
وابستہ ہوں چشم خوں چکاں کا

ہرگز نہ ملا تری گلی سے
ممنون ہوں جسم ناتواں کا

سوز آگے ذرا سنبھل کے جانا
بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا

ولہ

جگر سی آہ دل سی نالہ سینہ سے فغاں نکلا
سرے تن سی کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا

جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب عرش اعظم ہی
خدا کے واسطے دیکھو کہاں سی جا کہاں نکلا

ولہ

الٰہی محبت کو لگ جائے لوکا
کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبھوکا

فریب محبت نے مجھ کو پھنسایا
میں بھولا میں بھولا میں چوکا میں چوکا

جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا
وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہو کا

ولہ

مرا قتل کیا دل ربا نے نہ چاہا
وہ کب چوکتا تھا خدا نے نہ چاہا

ولہ

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ تو ای مستِ خواب — دھرتے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب
مسندِ فرعونیت پر بیٹھتے تھے جو یہ باز لو — اہلِ استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب
خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں — کون سا ان میں سے ہے رستم کون سا افراسیاب
بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو دماغ — واہ واہ اُن کو بھی کہہ لو آفتاب اور ماہتاب
پوچھیو تو باندھ کر کس پر چلا ہے تو کمر — میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ و تاب
ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ وا — ایک دنیا دار سے مل کر بنے عالی جناب

ولہ

اشک کب ہوں تیرے مستانے کی خشک — کوچے کب ہوتے ہیں میخانے کے خشک
چوری چوری منہ ترے شاید لگا — ہونٹ کچھ بے ڈھب ہیں پیمانے کی خشک
زلف کی پلٹوں میں کیا جا کر پھنسا — یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ولہ

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم — روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم
میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری — نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم
دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اب زیادہ — اے لالہ داغ دل کے کریں شمار ہم تم
تو میری دل کو دیکھ اور میں تیری دل کو دیکھوں — دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم
تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا — اے میر سوز صاحب تھے یادگار ہم تم

۳۔ سجاد

سجاد تخلص، میرِ سجاد نام اکبرآبادی۔ وطن بزرگوں کا انکے آذربایجان ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہ جہان آباد میں پائی ہے۔ اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ صاحب مذکور سے زیادہ ہے سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی اُستاد ہے میر محمد اکرم خاں واداان کے دار الانشائے بادشاہی میں نواب یحییٰ خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ اور حقیقت آگاہ تھے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان پُر بیان ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں ؎

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نہیں — جوں فیل مست آوے ہے ابر سیہ پلا

وله
کافر بتوں سے داد نہ چاہو کہ یہاں کوئی — مرجا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا
گر تیرے گل کے آنے نے کھوئی نہیں حواس — سجّاد کیوں پھرے ہے سجن آج فق ہوا

وله
یعقوب کے جب عشق پڑا سر پہ ٹوٹ کر — آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کر

عشق میں جائے گا بے طرح مارا — بے طرح دل ہوا ہے آوارا
خط کتروا کے آج قینچی سے — ہم سے ملنے میں جائے ہے کترا

غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیری جا کر دل — پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا
تجھ کو اے سجّاد غیر از خنجر بیداد کے — اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا
بتان تو چاہتے سجّاد تجھ کو — کریں کیا پر خدا نے جو نچاہا
مقبول اس جہاں کا ہرگز غنی نہ دیکھا — راجہ بھی ہی جو کوئی یہاں سے گیا ہے راجہ

وله
شتابی پلا لے کہ جاتا ہے ابر — جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب

وله
دور میں رخسار کے تیرے کہیں انصاف نہیں — خط چرا لے جائے دل کو اور باندھی جائے زلف

وله
جس خوبرو کے دل میں نہ عاشق سے ہو نفاق — کہتے ہیں سارے اُس کے تئیں حسن اتفاق

وله
ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سو لیجا دے اُسے — خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم

وله
جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں — سب مزے در کنار ہوتے ہیں

وله
بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے — یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے
اے صنم زنار پہنی تجھ وفا کے واسطے — ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہے خدا کے واسطے

وله
کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا — کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا
کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں — یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا

وله
میرے تمام حال کی تقریر ہے یہ زلف — روز سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف

وله
رہو آہ دل سوز میرے سے فرق — کہ ہے خوشہ چیں اُس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار دلا کر کے اے سجن	لا گا نہیں گلے سے مرے آج لگ
بخت جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھا کر	ولہ اگر تے ہو ہم سے باتیں اب تم چپا چپا کر

باب الشین

۱- شورش

شورش تخلص، میر غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے مشہور میر ہینا کر کے تھے۔ بھانجے تھے ملا میر وحید کے۔ اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے، اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے انہوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے، اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے"۔ ایک تذکرا شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انہوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے فنا سے جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مرتب ہے۔ یہ ان کے کلام کا منتخب ہے ؎

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا	بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا
کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام	ولہ قسم مغاں کی ہے ساقی کہ مجھ کو نام سے کام
اُٹھی یہ اُلفتِ گل کے سبب سے سب ایذا	وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سے کام
ہماری صبح رخ یار شام زلف نگار	نہ مہر و ماہ کے ہے ہم کو صبح شام سے کام
ہر ایک دم میں ہیں وصل و ہجر میں موجود	غرض نہ نام سے رکھتے ہیں نے پیام سے کام
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش	ہوا کرے ہمیں ہے یار اپنے کام سے کام

بابُ الصّاد

۱۔ صانع

صانع تخلص۔ نظام الدین احمد نام۔ ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ محبان قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے، اور دوستان صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سنتے، تو گھڑیوں روتے، اور بے چین رہتے۔ عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار، استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشدآباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ[۱] ہجری میں، ملکِ وجود سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مترتب ہے ان کا۔ اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس نکو کردار کے ہیں +

سجن کی اُس محبت پر دیا تھا جان و دل صانع
نہ تھا معلوم ہوجاوے گا وو نامہرباں اپنا

ولہ

جلے بھُنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں
تو دو دو دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں

قسم ہے تیری ہی، کھانے میں یار تیر نگاہ
جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں

وہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں ستی آگاہ
جو کوئی دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں

خدا بچاوے غم و درد ہجر عشق میں آہ
ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں

نہ کوہ کن سے ہوئی بے ستوں میں صانع راہ
بڑے وہ مرد ہیں جو دل میں راہ کرتے ہیں

ولہ

ہوا ہی شوق مو ہن کو دھڑی ہونٹوں جمانے کا
نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

[۱] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا

صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا	یہ بلبل شاخِ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے

بابُ الضاد

۱۔ ضیا

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہجہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر تھے۔ نظم ریختہ میں مالک تھے طبع بلند کے، او رصاحب تھے ذہن ارجمند کے۔ دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے، تو طور سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی۔ اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کلام کے ساتھ ہے، اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکر غزلیات ہے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور ورومند، رنج وراحت میں ہمیشہ خورسند تھے از بسکہ مدار دنیائے فانی کا فنا پر ہے راہ گذار جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں ؛

آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کملانے لگا		باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا
اُس کے کوچے میں ضیا پھر آج تو جانے لگا		کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگِ خلق
جو کوئی مرتا ہے اس کے حلق میں پانی چواتے ہیں	ولہ	پلادے آبِ خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں
کہ سیلیں روتی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں		ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں
کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لہو سے آتے ہیں		ضیا رکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی لے ظالم
صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا کو دیکھا	ولہ	گریاں و خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا
یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے		اے آہ بچ نکل نہ کہیں دل تھلک پڑے

پیترے ضیا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے	اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک پڑے

بابُ العین

۱۔ عزلت

عزلت تخلص، سید عبدالولی نام۔ خلف شاہ سعید اللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعید اللہ کہ سرِ دفتر فاضلان اور سرحلقہ صاحبدلان تھے۔ اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے، لیکن ازبسکہ اقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلی میں سے گئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے۔ تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ باوصف حکمت و فضیلت کے اوضاع و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی وردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے، اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سرزمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی، اور بقایائے عمر اسی مملکت میں بسر کی۔ دیوان ان کا مدت سے پاچکا انتظام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے۔

فقیروں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں		ترا جامہ گلابی ہے تو میرا خرقہ بھگواں ہے
بہار آئی چمن میں غل ہے بلبل کی صفیروں کا	ولہ	جدا ہے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا
عبث تو رام دل ناز سکھلانے کے کام آتا		یہ آئینہ تھا، اُس خود بیں کے اترانے کے کام آتا
جلایا صحفِ دل تو نے کیوں برقِ تغافل سے		جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کرتا ہیں گا — ولہ — کہ پتھروں کو وہ صندل دردسر کا جانتا ہیں گا
بگولہ بن کے راہ بی ستوں میں کوہ کن ایک — سُمِ گلگوں کی ماٹی ہاتھ مل مل چھانتا ہیں گا
سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں — اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا
مجھے چاہے کہ پتھر مارے جب دشنام سکیں گا — غلیل ابرو کے غزلت کس مزہ سے تانتا ہیں گا
ہوا ہی داغ اُس کا مغز نازک آتش گل سے — ولہ — چمن زادوں میں اک مزامنش لالہ ہوا پیدا

جدھر نکلے وہ ہولی باز بانکا — ولہ — گلابی ہے غبارِ راہ وہاں کا
نخل اُمید بیوفایوں سے — ولہ — دل سلامت رہے تو پھل پاتا
اول ہمیں عشق اپنے سے بیہوش کیا — ولہ — یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا
ہم نے بھی جرس وارا ہی یار سفری — دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار — ولہ — کلال سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار
یاروں کی خاطروں کی کیا دل مرا خبر لے — ولہ — ہیں پر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے
جوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آوے — ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے
ہم ہیں مفلس یار کی قیمت گراں کیا کیجئے — ولہ — ہم زمیں اور اُس کا رتبہ آسماں کیا کیجئے
بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا — ولہ — کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں — ولہ — تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم — کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں
پیر ہو یا شیخ ہو ہے دیکھو طفلاں کا مرید — ولہ — مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی
دل میں رندوں کے پھپھولا ہوا عمامۂ شیخ — ولہ — یارب اس بزم سے یہ زہر کا ٹکڑا جاوے
کھلا کے دل جسے پالا سو ہے مراد الی — ولہ — جناب پاک جنوں مدظلہ العالی
شانہ اُس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا — ولہ — بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے
شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ کر — یہ ٹوٹے آئینے میں منہ تری بلا دیکھے

۲۔ عشق

عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہ جہاں آبادی۔ نواسے
شاہ فرہاد کے عمدہ مشایخوں میں سے ولی تھے۔ جہاں بیان ہوتی۔ شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے،
تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔ غرض عشق مذکور ایام شباب میں شاہ جہان آباد
سے مرشد آباد میں آئے، اور خواجہ محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیاداری میں ایک مدت
ایام حیات بعزت تمام بسر لائے۔ اگرچہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں امرایان
مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی
کی طرف آیا، اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور
و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی، اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں شاہی کی۔ طالبان راہ
عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے
ہجری تک داد حال وقال کی دی۔ آخر بلدۂ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک
اجابت بآواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں مترتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے:

کہنے کو ادھر ادھر گئے ہم تا جاں نہ ہوئی عدول حکمی		تھے تیری طرف جدھر گئے ہم تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم
بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں	ولہ	عشق رخصت دے تو شور حشر برپا کروں
نے درد دل ہے باقی نے آہ و نے فغاں ہے	ولہ	اے سوز عشق سچ کہہ تو ان دنوں کہاں ہے
دیکھے بن اس کے یک دم چین یہ رہتا نہیں	ولہ	اس دل کافر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم
جوں آفتاب تاباں گو نام کو عیاں ہوں	ولہ	یہ پرتو ہے تیرا ٹک دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں ہے ظاہر میں میرا یارو		جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دیوانے		میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

وله

عرش تا فرش سیر کر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشمِ تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا — کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا
تیغ کے نام پر تڑپتا ہوں — اس طرح کا کہیں جگر دیکھا
آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو — نخلِ اُلفت میں یہ ثمر دیکھا
سحر میں سامری کے کیا قدرت — تیری نظروں میں جو اثر دیکھا
اپنے ہم چشم سے لگا کہنے — نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا
ملک اک انصاف سے اگر دیکھو — عشق سا کوئی چشمِ تر دیکھا

وله

دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا — حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت کر — عشق میں تو نے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے — اُس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا
وحشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی — عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا

وله

از عدم تا وجود آ دیکھا — جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم — مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہویا ہو — پر تجھے سب سے آشنا دیکھا
اُس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم — خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفا میں کہ تو کبھو — لب مرا شکوہ میں ہلا دیکھا
کبھو غم سے جدا نہ دیکھا میں — عشق کو جا کے بارہا دیکھا

وله

میں کافر ہوں اگر منظور ہووے لطف مرہم کا — کہ یہ داغِ جگر ہے یادگار اُس یار ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روز فردا ہے — کہاں فرصت ہے اے ناداں بھروسا ہی کہاں دم کا
رُلانے میں مرے کچھ تجھ کو ہیگا فائدہ کہ تو — مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا اور مردم کا
کفایت ہے بروزِ حشر مجھ کو شفقتِ حیدر — کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

چاک دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا بے وفائی تری دل دیکھ کے او وعدہ خلاف	لخت دل زینت داماں نہ ہوا تھا سو ہوا عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

۳-عیش

عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے اپنی جہانگیر کی ایک مدت رہی، اور زندگی اُنھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص وحکایت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودب باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم و باحیا ہیں۔ وطن تو ان کا شاہ جہان آباد ہے، لیکن ایک مدّت سے مرشد آباد میں آ کر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا مورد اشتہار ہے، یہ اُن کا خلاصۂ افکار ہے +

وہ اگر آوے سر بام کہیں	میں بھی کر لوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ، دی ساقی	ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اسے چرخ	لیجو مت مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش سے ہے تصدق سونز	مجھ سے ہوتی تھی انصرام کہیں

باب الفاء

۱- فقیر

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام، متوطن شاہ جہان آباد کے۔ اُستادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام فیضی کے، اور خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کر سکے۔ دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں ہر روز زندگانی کا انھوں نے

نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے، اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامۂ سحر آفرین نے اُس میں جادو کاری نہیں کی، اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلک گوہر سلک سے اُس میں دُرباری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں انکی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے، اور بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحر معنی کے گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو باد مخالف نے صدمۂ طوفان دیا، اور دریائے مسقط میں غریق بحر رحمت کیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہل کمال کا دون مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوش روزگار ہیں

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے — تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے
ہے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں — خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے
دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے — لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے
کس نظر ناز نے اُس باز کو بخشی پرواز — سیکڑوں مرغِ ہوا پھاند کے پر بیٹھ گئے
کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی — نالہ کرنے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے
صفت اُٹھنے کے نہیں یار کی کوچہ سے فقیر — جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

ولہ

آہ تو نے تو کئی بار ہلایا ہے فلک — زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے گی دھمک
کل ہی کی شب کا ہے مذکور کہ جبریل آئے — خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

ل آج کل باندھ بولتے ہیں۔

۲۔ فغاں

فغاں تخلص، اشرف علی خاں نام تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ خلف میرزا علی خاں نکتہ کے۔ آٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا۔ کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، اور مربی گری سے ظرافت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے۔ چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا۔ اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا۔ دلی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے۔ لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے۔ بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہاں ٹھیرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے۔ اتفاق اصلاح سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے۔ نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے سنہ ۱۱۸۶ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نہ اٹھتا سمجھ کر آشنا بحر بے کنار بقا کے ہوئے۔ بلدۂ عظیم آباد اُس شیریں کلام کا مدفن ہے، اور تلخی روز حشر تک اب وہیں مسکن ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں +

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا	تیری کب آستیں مری لوہو سے بھر گئی
ہستی کے خوب نظر آتے جو عدم میں	ولہ ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا
اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے	پس چاہیئے تسبیح میں زنار نہ ہوتا
مجھے تو تعزیہ دار اپنا کر گئے اپنے	ولہ کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغ چمن	اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً	اُدھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا	کہ اس سفر کا مسافر تو گھر گئے اپنے
شب فراق نہ تنہا مجھے رلاتی ہے	ولہ یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دھلاتی ہے

اگر میری زبان پر بار دیگر انتظار آوے ‏ ‏ولہ‏ ‏ ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے

دل زلف میں الجھا ہے مجھے آرام یہی ہے ‏ ‏ولہ‏ ‏ میں صید بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے

تار کی طرح کہیں زلف بتاں سے ٹوٹے ‏ ‏ولہ‏ ‏ یا الٰہی دل بیمار بلا سے چھوٹے

ضعیف ہے دل بیمار اس قرینے سے ‏ ‏ولہ‏ ‏ اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے

عشاق تیری گرمی بازار کر گئے ‏ ‏ولہ‏ ‏ اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے

اُٹھ چکا دل مرا زمانے سے ‏ ‏ولہ‏ ‏ اُڑ گیا مرغ آشیانے سے

دیکھ کر دل کو مڑ گئی مژگاں ‏ ‏ ‏ ‏ تیر خالی پڑا نشانے سے

ہم نے پایا تو یہ ستم پایا ‏ ‏ ‏ ‏ اس خدائی کے کارخانے سے

غیر از دوئی کے مانع دیدار کون ہے ‏ ‏ولہ‏ ‏ وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے

بیم غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دور ‏ ‏ ‏ ‏ گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے

جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے ‏ ‏ ‏ ‏ آسودگانِ خاک میں بیدار کون ہے

میں مرگیا پہ آہ نہ پوچھا فغان مجھے ‏ ‏ ‏ ‏ درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۳۔ فرحت

فرحت تخلص ہے شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسد اللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے، وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراء النہر ہے لیکن فرحت مذکور نے دِلّی میں پرورش پائی ہے، اور عاشق مزاجی و دل بستگی ہی میں عمر گنوائی ہے۔ ہمیشہ بندِ عشق میں مسلسل مویوں کے گرفتار، اور سدا ورد عشق سے بیگانہ خوبوں کے یار۔ شاعرِ کہن مشق و ہم صحبت شعراء نامدارِ شاہ جہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "یہ عزیز مبتلا اخلاص مند تھا، اور عسرت کا مورد گزند تھا۔ جب کہ دلّی سے مرشد آباد میں آیا، اور طور سکونت کا وہاں ٹھیرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیران حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز

کا نباہ ہوتا تھا۔ آخر الامر ۱۱۹۱ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا، اور اس دارِ محن سے، خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبان ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے، یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے ۔

گذرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا	دیں چھوڑ بے کلی سے گل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے نالے میں ہے اگر کچھ	ہووے وہ آہ یارب کس طرح یار اپنا
جاوے کہیں بھڑک بہت آتش سے دل کی میرے	رکھ دور مجھ سے دامن اے کوہسار اپنا
اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے	اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
آنکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم	ہرگز نہیں ہے دل پر کچھ اختیار اپنا

۴۔ فدوی

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بچو، متوطن تھے اُس اُجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہان آباد، کرکے۔ نظم ریختہ میں اُستاد ہے۔ تلاشِ معنی میں فکر رسا رکھتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست، اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چست۔ چند روز انہوں نے اوقات مرشد آباد میں بسر کی ہے، لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے۔ آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے چنانچہ اُسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا، اور ایوانِ مہمان دوست عدم میں اسباب سکونت کا بھجوایا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے ۔

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا	مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا
ایسا نہ ہو رندوں کی کرے کج ہو کہیں مندیل	میخانے سے اے شیخ خبردار گذرنا

فدوی دیکھو خوباں کی کر اک آن کی خاطر		مر جائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا
اُس پہ کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے		ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گذرنا
کل یار کے کوچہ کی طرف گذریگا فدوی		مت آج سے تو اُس طرف اغیار گذرنا
ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا	ولہ	پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا
تجھ کو انہیں آنکھوں کی قسم تیر نگہ سے		ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گذرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا		اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا
گر نیک و بیا تم نہیں جاتے تو نہ جاؤ		ہے مجھ کو تو اس کوچہ سے لاچار گذرنا
شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سو بار		فدوی کے تئیں ہو پسِ دیوار گذرنا
وہ کافر ہماری شب تار ہے	ولہ	جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

بابُ القاف

۱۔ قایم

قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام، متوطن چاندپور بدینہ کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا انہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا رو برو اُس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دام، اور خجالت سے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا

(حاشیہ: غالباً صحیح نام نگینہ ہے)

اس جہان فانی سے اُٹھ جانا، اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلانا۔ اُس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری ہیں، اُدھر ہی نواح وطن میں اپنے، اس دارفانی سے سیر عالم باقی کی کی، اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اُس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے +

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا ‏| اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا

دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا | ولہ | آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم | | کیا کروں پر رہا نہیں جاتا
یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا | ولہ | پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
خوباں کی طرف رکھنی کا بندہ ہوں میں قائم | | ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا

بنی بھوں سی ڈرا چاہئے کہ کہتے ہیں | ولہ | کرے ہے کاٹ سروہی سے بیشتر اونا
جب تک کہ ہے تو ہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ | ولہ | جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا
عہدہ سے اُس صنم کے برآیا نہ جائے گا | ولہ | یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ | | کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا
ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا | ولہ | ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا
کہاں ہے شیشۂ محتسب خدا سی ڈر | ولہ | مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا
دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہ گیا | ولہ | درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا
میں اس چمن سی اور یہ مجھ سے چمن گیا | ولہ | لے دل میں اپنے حسرت سروِ چمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کی کر ذوق سے معاش | | پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر | | روٹھا تھا تجھ سی آپ ہی میں اور آپ ہی من گیا
روؤں گا زیر سایہ دیوار بیٹھ کر | | جس دن تری گلی میں کوئی داؤ بن گیا

زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات	ولہ	ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات
خوب نکلے ہم اُس کے کوچہ سے		ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل		دل گر ا شاید اضطراب میں رات
بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر	ولہ	ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر
بے شغل نہ زندگی بسر کر	ولہ	گر اشک نہیں تو آہ سر کر
کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی		اس سے جو کوئی جیا سو مر کر
کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس	ولہ	میں نہ شائستہ بسمل نہ سزاوار قفس
جب موج پر اپنی آگئی چشم	ولہ	دریا دریا بہا گئی چشم
اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم	ولہ	پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم		جب گالیاں نت کی کھائینگے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں		اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا		ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
جوں چاہئے چاہ کا سرشتہ		قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم
نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں	ولہ	کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے		حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات	ولہ	ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں
نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لپٹیاں	ولہ	یکا یک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں
جب اُسے غیر سے ہونین کھلانے کا شوق	ولہ	سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفہان مجھ کو
راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اُسے گھیر کبھو	ولہ	ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے بہر کبھو
اتنی اے دیدہ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو	ولہ	دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو
کبھی دکھا کے کمر اور کبھی وہاں مجھ کو	ولہ	نپٹ تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر		نسبت ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو
جو کہ چھلیں تھیں سو ہانے گئیں وہ یار کو ساتھ	ولہ	سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے		بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ
میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو		جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
تھی شرط مجھے اُس سے تو اک رات بسے کی	ولہ	کیا ہے کہ دل اُس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا
تیغ چڑھ اُس کی سان پر آئی	ولہ	دیکھیں کس کس کی جان پر آئی
دہن کو تیرے پایا بات کہتے	ولہ	ہماری جزرسی میں کیا سخن ہی
دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہی	ولہ	یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہی
میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو	ولہ	بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے
مُردنِ دشوار میں یہ حال بے تقصیر ہی	ولہ	حسرتِ دل سو طرف سے اُس کی دامنگیر ہی
قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل		غرق آب شرم میں اب تک دم شمشیر ہی
مر جایئے کسی سے پہ اُلفت نہ کیجئے	ولہ	جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے
مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے	ولہ	جو گذرے ہی مجھ پر خدا جانتا ہے
یاس ہیں تجھ غم کے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی	ولہ	دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ		دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
بعد خط آنے کے اُس سے تھا وفا کا احتمال		لیک واں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی
دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے	ولہ	شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں		میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہی
ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج		اس حکایت سے جی بہلتا ہے
گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے	ولہ	کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے
زاہد درِ مسجد پہ خرابات کی تو نے	ولہ	جی بھی ہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر بغل میں		اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے
مرا جی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے	ولہ	پر اتنا بھی تو ناکارہ نہیں ہے
بتوں کی دید کو جاتا ہوں ورنہ میں قایم	ولہ	مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے۔
کیا ہی مکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور	ولہ	آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے
قایم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر		دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے
کیا چشم ہے دنیا کہ یہ ارباب نعیم	رباعی	بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ		محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید	صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر	گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے	سبز وہ شال کی رضائی ہے
دن کی کٹتی ہے دھوپ میں اوقات	کالی کمل میں رات کاٹے ہے رات
چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش	نہیں یہ کہکشاں ہے دانا کیش
ندی پر آکے بیٹھے جو بگلا	پروں سے اپنے ڈھپے ہے وہ گلا
برف کوچوں میں یوں پڑی ہے صاف	جوں کہ اُڑتا ہے پنبۂ نداف
کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار	ٹھنڈی سی ہے فلک کے جی میں غبار
پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ	نکلے ہے منہ سے آسماں کے بھاپ
باد چلتی ہے بسکہ تند و سخت	روز و شب کانپتے رہے ہیں درخت
گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل	پر کہوں کیا میں حال اہل دول
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور	جس طرح ناشپاتی و انگور

جا کے حلوائی کو جو دیکھو کہیں	برفی چھٹ کچھ دکاں میں اُس کے نہیں
قایم اب سردی کا ہے یہ مذکور	شعر ہو گر خنک تو رکھ معذور

مخمّس

یشیخ تو نابود ہووے یا ترا پندار نیست	بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہبِ دیندار نیست	کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن	دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو جی چاہے تو چن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آ یہ بات سُن	ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن

نسبتِ باریدگی وار دوے خونبار نیست

	رباعی	
دیکھ حال مرا اُٹھا کے سو سو حیلے		ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم		سو اُس کے بھی ہو چکے ہیں کتنے ڈھیلے

۲۔ قدرت

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام۔ ساکن شاہجہان آباد کے۔ مشہور سخنوروں میں سے تھے رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔ صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے نظم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر، اور راگ شگفتگی و برجستگی کلام سے اُن کے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن نظم ریختہ پر مرتے تھے۔ تازہ کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالوں سے ہند کے دمساز تھے۔ وارستہ مزاجی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلّی کو چھوڑا تھا، وارد مرشد آباد تھے، اکابر اور اعزہ اُس شہر کے سب ان سے بر سر عنایت و امداد تھے۔ علی ابراہیم

خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طور کا اُستاد تھا۔ شاید ۱۲۰۵ھ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا" دیوان میں اُس صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں انکی منتخب افکار ہیں ◆

ہنگامۂ بہیز و ورع اب بسر آیا
اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابر تر آیا

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے
شاید تہ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا

غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف
پیری میں تو ٹک چونک کہ وقت سحر آیا

ولہ

ترے حضور میں جب قصد عرضِ حال کیا
ہجوم گریہ نے میری زباں کو لال کیا

میں داغ تازہ میں تو ڑے یہاں تلک ناخن
کہ ایک بدر کا کاسہ یہ از ہلال کیا

ہوا ہے اُس کے گلو میں گرہ دم اعجاز
ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

ولہ

ٹوٹی کمند بخت کا وہ زور رہ گیا
جب بام دوست ہاتھ سے کچھ دور رہ گیا

اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے
ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

ولہ

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو مسدود تھا
یک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پر دود تھا

کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا پر ظہور
رہی اپنی حد میں جو بیٹھا تھا اک نمرود تھا

حالِ قدرت پوچھتا ہے کچھ تو ظالم مجھ سے سُن
اُس کے بالیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا

آہ جو اُٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی
اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

ولہ

بیتابیوں سے یہ دلِ بیتاب رہ گیا
اپنی طپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا

آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشم تر
دریا اُتر گیا ہے یہ گرداب رہ گیا

ولہ

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا
یار گھر جانے لگا ای وائے گھر جانے لگا

جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہو زندگی
کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی
آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

کب تلک ای نالہ زیر لب رہیں گا تو گرہ — حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا

ولہ

دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا — لخت دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا

تو نے گو مجھ کو دلاسے میں رکھا — جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا

ولہ

دل ہوا اسیر زلف سیہ فام رہ گیا — صید ضعیف مر کے تہ دام رہ گیا

جب دیکھتا ہی مجھ کو تو دیتا ہی گالیاں — اپنے نصیب کا یہ اک انعام رہ گیا

آگے نہ چل سکا تری کوچے کو چھوڑ کر — خورشید جا کے تا بہ لب بام رہ گیا

قدرت کس آسکے یہ کہو کی یہ زندگی — آنے سے اب تو نام و پیغام رہ گیا

ولہ

آتش فروز دل ہی تماشا حسن شعلہ رو کا — ہر اشک ہی شرارہ ہر آہ ہے بھبھوکا

ڈھونڈھے ہی پاس اب کیا سینہ میں غمزدوں کے — مدت سے لٹ چکا یہاں سامان آرزو کا

کشتہ ہوں جان و دل تیرے خدنگ کا میں — بحر کہاں ہیں ہیگا پیاسا مرے لہو کا

ولہ

تشنہ لب مرتا ہی نت موج دم شمشیر کا — اے غرور ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا

خواب غفلت لگ گئی تھی ان دنوں دل کو ابھی — آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا

ولہ

رنگ خون تشنگاں جس جا سے اڑ سکتا نہیں — ہوں اسیر ناتواں اس خاک دامنگیر کا

ولہ

گھر سے جس وقت وہ غارت گر ایماں نکلا — کفر سے کہہ گیا دیں سے مسلماں نکلا

وہ دل جمع کر اٹھا جو بغل سے اپنی ؎ — تو بزیر شکن زلف پریشاں نکلا

ولہ

اس چشم سے ہو کے آب نکلا — سینہ سے دل خراب نکلا

جو نالہ جگر سے پار نکلا — لے سیخ پر اک کباب نکلا

خط آیا و لے ہمارے خط کا — منہ سے نہ ترے جواب نکلا

ولہ

بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا — کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا

ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر — دل ہی خدنگ دوست جگر ہی سناں طلب

ولہ

دست برد ظلم سی تیرے ہیں جتنے ہم خراب — اس قدر بھی ہووے گا عالم میں کوئی کم خراب

زخم سے دل کے ابھی اے چارہ گر بہتا ہی خوں		مت ڈبوئے فائدہ بھائے نہ کر مرہم خراب
کھڑے رونا کھڑے سر کو پٹکنا	ولہ	خوشا ایام او قاتِ محبت
ہرزہ گردی سے رہائی کے چھٹا	ولہ	پھر مجھے زنداں میں اسے زنجیر کھینچ
جان ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ		میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ
ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد	ولہ	کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد
جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ	ولہ	سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ میں نہ لے کاغذ
میں کیونکہ اُس کو لکھوں خط جب اشک و آہ سے یہاں		ادھر جلے قدم اور اُس طرف گلے کاغذ
کسے جز خونِ دل میخانہ میں منظور ہے ساغر	ولہ	مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہے ساغر
آہ روئے پاک تیرا کس طرح آوے نظر	ولہ	لختِ دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر
یہ دلِ شوریدہ جیسے ساتھ ہے زیرِ زمیں		شورِ محشر ہی رہا قدرت کی مشتِ خاک پر
تجلی جلوہ چاہے تو صفائے سینہ پیدا کر	ولہ	اگر دیدار کا طالب ہے، تو آئینہ پیدا کر
ہے نالۂ شام، آتش و آہ سحر آتش	ولہ	کیا زیست ہو اپنی اِدھر آتش اُدھر آتش
جز داغ تدارک نہیں اس داغ جگر کا		آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش
پھاہے کو اگر داغ سے چھاتی کے چھڑا دوں		خاشاک کے پہلو میں چھپے آن کر آتش
چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف	ولہ	لے چلے حسرت بھرا ہم ساتھ ہی دلِ افگار حیف
جرم پر تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل		حفظِ جاں کے واسطے گر کیجئے انکار حیف
مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق	ولہ	ورنہ کیا جانوں کہ سر پر کیا بلا لائے فراق
زخم پہلو نے نہ پائی آہ دل ناکام تک	ولہ	حیف پہنچا ہے نہ اپنا کار شوق انجام تک
صبح کے ہوتے ہی ہو جس کی یہ حالت تباہ		آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک
کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو دردِ انتظار		جب تلک پہنچے ہے قاصد اُس بتِ خود کام تک
ہم نہ کہتے تھے کہ قدرت مت چمن کی راہ چل		لے گئی آخر ہوائے گل شکنج دام تک

رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا بیتاب دل

گرے تھے آکے اس در پہ سمجھ کر اپنا مامن ہم
ہوا یوں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
شب ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کرتے ہیں

جوں نقشِ قدم ہیں ترے وے خاک نشیں ہم
نسبت ہے ہماری تری جوں سایۂ خورشید

گئے وہ دن کہ پلک مارتے یاں ویرا ہے
تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور

ابرو ترے کہتے ہیں کہ میں تیغ دو سر ہوں
شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا

دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
قدرت بزیر خاک بھی آرام کب ملے

آگ اُس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
مرحبا آتش دوری کہ جلایا ایسا
زخم پر زخم لگے تب ہو تسلّی دل کی

شام کو دھوتا ہوں سو خون جگر سے آستیں
تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
لختِ دل اور اشک ہرگز خاک پر گرنے نہ دے

جنوں تیرے ناخن مگر گھس گئے ہیں
ٹپکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے

وله
ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل

وله
اگر تو ہے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم
گنے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم
کبھی سر کو پٹکتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم

وله
تا مٹ نہ چلیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہی نہیں ہم

وله
اب بصد خون جگر چشم کو تر کرتے ہیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں

وله
عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں
ای وائے میں قدرت نہ اِدھر ہوں نہ اُدھر ہوں

وله
ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں
یہ درد و داغ ساتھ ہے میرے جہاں رہوں

وله
پھوٹے وہ آنکھ جو لختِ جگر آلود نہیں
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں
جو صلے پر مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

وله
صبح خون آلودہ ہے پھر چشم تر سے آستیں
کردے اب رشکِ چمن خونِ جگر سے آستیں
بھر لے ای قدرت تو اس لعل و گہر سے آستیں

وله
کہ عقدہ پڑا ہے بکارِ گریباں
پھر آئی ہے فصل بکارِ گریباں

قافلہ کے قافلے اس رہ میں جوں نقشِ قدم	وله	ہو گئے پامال تیرے حسرت پابوس میں
بہ نہ کر مرہم سے داغِ سینۂ پر نور کو	وله	کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغِ نور کو
داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا ایک دم		زخمِ سینہ سے سدا الفت رہی ناسور کو
تب مزا دیوے گا قدرت زخمِ سینہ پر نمک		دے سرِ ناخن سے پہلے آشتی انگور کو
نہ جا اس بزم سے ہرگز جھٹک مت طرف داماں کو	وله	نہ دے برباد اے ظالم غبارِ خاکساراں کو
ہوا دستِ جنوں سے تار تار از بسکہ پیراہن		گریباں ڈھونڈھے ہے داماں کو اور داماں گریباں کو

تم نے تو منہ چھپایا اس زلفِ عنبریں میں	وله	یہ شامِ غم ہماری اب کس طرح سحر ہو
میں رکھتا ہے ابرو کماں کے نشاں کو	وله	ہما چھیڑ پوست مرے استخواں کو
گلوگیر ہے یاں تلک ناتوانی		کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو
اڑائی ز بس خاک ماتم میں دل کے		کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں چھاتی تیری	وله	مرہمِ تازہ ناسورِ کہن چھوٹے ہے
کس کی نیرنگی یہ برق خاطرِ مایوس ہے	وله	جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے
صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئے		اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	قطعہ	کیا ہی ملک دم و کیا ہی سرزمین روس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے		چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف		جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے		یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و مکنتِ دنیا سے آج		کچھ بھی ان کے ساتھ جز از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا		آج رہنِ جام نے پھر خرقۂ سالوس ہے
سینہ اس کا ہی دل اس کا ہی جگر اس کا ہے	وله	نیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے
اس گلی سے جو کوئی گذرے سو جی سے گذرے		دیکھ اس راہ نہ چل راہ گذر اس کا ہے

لختِ دل نوکِ مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم
تخمِ غم دل میں جو بویا تھا ثمر اُس کا ہے

ولہ

نہ تھی تاب نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے
نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نورِ دیدہ آنکھوں کے مقابل ہی
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعفِ ہجر سے از بس ہے لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

ولہ

کر اقلیمِ قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشمِ مور سے بھی تنگ تر ملکِ سلیماں ہے

لبِ قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

ولہ

نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
گیا میں وادیِ اُلفت کو لے اک جنبشِ دل سے

گئے وے دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اور کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صیدِ نیم بسمل سے

ولہ

غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد و شیریں ہے کدھر لیلیٰ و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذری ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشمِ پرخوں ہے

ولہ

آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

ولہ

دل پر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے
دستِ اُمید ہے اور دامنِ مایوسی ہے

دلِ گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیر بیداد سدا اور پئے جاسوسی ہے

دمِ جاں بخش کی اُس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لبِ عیسیٰ نے مگر تیری زباں چوسی ہے

ولہ

جس جگہ جلوہ نما یہ مدہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقشِ پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

ولہ

سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبالِ جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشمِ عبرت
گر فکرِ سراغِ رفتگاں ہے

جو نقشِ قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حالِ رہرواں ہے

اشک آنے ستی کچھ تھم رہے	ولہ	لخت دل مژگاں پہ شاید جم رہے
اب تو اس منزل سے نہیں اٹھتے قدم		ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے
ہر آن اک ستم ہے ہر لحظہ اک جفا ہی	ولہ	کوچہ ترا ہے ظالم یا دشتِ کربلا ہے
ملتا نہیں کسی سے اس پر ہی کیا مصیبت		یارب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہے
ہو گرد باد جیدھر ہم کو ادھر ہے جانا	ولہ	صحرا میں گمرہوں کا یہ خضر رہنما ہے

بابُ الکاف

۱۔ کلیم

کلیم تخلص، شیخ محمد حسین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ مشہور سخنور ہے دلّی کا، اور قرابتیوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا۔ ایک رسالہ عروض وقافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے، اور فصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے۔ ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختۂ قلمِ معنی رقم رکھتا ہے۔ لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے۔ عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا، اور زمرہ پردازانِ شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا۔ چنانچہ دلّی ہی میں اس خرابۂ دارِ فانی سے گذرا، اور مقیم بیت المعمور کا شانۂ باقی کا ہوا۔ صاحب دیوان اور شاعر شیریں بیان تھا۔ یہ اس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے۔

گو روضۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا	ولہ	جب گل کی طرح جھانک گریباں میں دیکھا
لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس	ولہ	وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم	ولہ	آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا
رکھتا ہے زلفِ یار کا کوچہ ہزار پیچ	ولہ	اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ ما پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق	ولہ	رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

پوچھ مت غم کی داستاں اے دل | ولہ | گر پڑا ٹوٹ آسماں اے دل
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم | ولہ | اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم | | یاں مارے ادب کے مر گئے ہم
بات اُس کی زبان پر آئی | ولہ | پھر خرابی جہان پر آئی

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے | ولہ | غرض ہم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
اُس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہئے | ولہ | اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہئے
عرق ہی منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہی | ولہ | عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہی
تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہی برسات | | پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے
گلرو تو چمن میں اچپلی سے نہ گیا | رباعی | یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں | | دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا
دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم | رباعی | اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب | | جب کچھ نہ بنا کہا کہ درویش ہیں ہم

بابُ اللّام

ا۔ لُطف

لطف تخلص میرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا، کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے۔ اور اسم گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے متوطن استر آباد دشجاعت بنیاد کے ہیں۔ ۱۱۵۶ھ گیارہ سو چھپن ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد میں تشریف لائے اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی بمصدر عنایات بادشاہی ہوئے۔ آگے بیان امورات دنیوی باعث ہی طول کلام کا، اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص

وعام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ اس تذکرہ میں اشعار ہندی کا التزام ہے، اس سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح فدوی کی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے، اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے۔ یہ خذف ریزے کتنی ایک کہ سراب گاہ طبع ناقص کے فراہم ہوئے تھے، عرض خدمت ارباب معنی کے کئے جاتے ہیں۔

پاس ناموس محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شب ہجراں زباں پر لائیں کیا

بلبل و گل ہیں وہ جوشش سرو قمری ہیں یہ ربط
گلستانِ دہر میں پھر دل کو تئیں الجھائیں کیا

غیر لبریز شکایت ہے مری جانب سے آج
سن کے میرے قدرداں اب دیکھئے فرمائیں کیا

چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان آیا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس
سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اس کو دھیان رہا

جو عمر خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگرچہ اپنے ایک آن رہا

نہ کر اے بلبل دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہے جلاد کا شکوا

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سنے فرہاد کا شکوا

میں اپنے سرو قامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلی ہو گئی قمری سے سن شمشاد کا شکوا

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اس خانماں آباد کا شکوا

ترے کانوں تلک بھی لطف [illegible] تا ہر
ہے اک عالم کو تجھ سے نالہ و فریاد کا شکوا

ولہ

ایک دن حال دل زار نہ دیکھا نہ سنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سنا

دیکھ کر نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سنا

لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس چراں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اس کی لطف — ثانی حیدر کرار نہ دیکھا نہ سنا

ولہ

ہے اس شدت سے رنگینیٔ کوئے یار کا چرچا — کہ بھولا عندلیبوں کو گل گلزار کا چرچا
ڈھکا رہ جائے اسرار محبت تو غنیمت ہے — ہوا ہے اب حکیموں میں مرے آزار کا چرچا
برنگ پیکر تصویر رہتا ہوں سدا ساکت — ہے اس پر اس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا
ہمیں ہے یار کی چپ سے یہ فرصت کہاں ہمدم — کہ اب دن رات بیٹھے کیجئے اغیار کا چرچا
بیان درد دل کس لطف سے کرتے ہزار افسوس — جو ہوتا بزم میں اس کی کبھی اشعار کا چرچا
زہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزم عیش سمجھے تھے — کھلی چشم حقیقت ہیں تو کام اژدہا نکلا
نہ کر اے لطف ناحق رہروان دہر سے حجت — یہی رستہ تو ڈھا کر دیر سے کعبہ کو جا نکلا

ولہ

ازبس نہ ہوا ہم سے سرانجام محبت — شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نام محبت
فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال — کس منہ سے اسے بھیجئے پیغام محبت

ولہ

کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل — ہیں دل میں تو سو باتیں اور جنبش لب مشکل
اک آہ کے کرنے کو سو چاہئیں تمہیدیں — کس سے کہیں حال دل ہے آہ عجب مشکل
دو لاکھ بہانے ہوں نت روئے دو آنسو — دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

ولہ

یاروں نے یہ تو کہو کیا کیا سجھائیاں ہیں — بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے رکھائیاں ہیں
میں کیا ہوں باختہ رنگ اس شعلہ رو کی آگے — ہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں
اک جوئے شیر بہہ لے اے آفریں ہے فرہاد — کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں
کب غنچۂ دل اپنا وا شد صبا ہو تجھ سے — گو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں
طاقت حباب ساں اک نظارہ کی ملی ہے — ان فرصتوں پہ ظالم یہ خودنمائیاں ہیں
کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدہ سے آگاہ — یہاں آستان دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں
اس قد کا سرو سے ذکر چھوٹا منہ اور بڑی بات — غنچہ کی دل میں بے ڈھب باتیں سمائیاں تھیں
اے لطف اس غزل پر کہنا بقول سودا — یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم
کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں

برگِ گل جس نمط خزاں میں گھٹیں
لخت دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں

بس غمِ یار اب خبر لے جلدی
ورنہ اب یار ہی نبڑتی ہیں

تم ہو بزمِ عیش سے وہاں اور صحبت داریاں
ولہ
ہم ہیں کنج غم میں یہاں اور جان سے بیزاریاں

تم کو سیرِ باغ و گلگشتِ چمن کا وہاں ہے شوق
یاں بدن پر ہے ہجومِ داغ سے گلکاریاں

دھیان ہے آرائشِ زلفِ پریشاں کا تمہیں
یاد ہیں حالِ پریشاں کی مرے کچھ خواریاں

تم صفاء ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں
ہم پہ یہاں موئے بدن کرتے ہیں نشترزاریاں

تم نے دکھلائی وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن
یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے نے لہریاریاں

نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موندلیں
تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوگاریاں

یہاں برنگِ پیکرِ تصویر ہم خاموش ہیں
گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں

قہقہے تم مارتے ہو وہاں با آوازِ بلند
دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں

ہر مریضِ غم کی جان بخشی کا ہے تم کو دھیان
کھنچ گئیں یاں طول شدت سے مری بیماریاں

اضطرابِ دل سے بے پردہ ہوا یہاں رازِ عشق
سوجھتی ہیں وہاں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں

کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں
اُن بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

نہیں یہ شیشہ مت ای محتسب مجھ دھومیں
ولہ
دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں

کب اپنی چشم میں طوفان نوح کو ہو قدر
نہاں ہے یہاں وہی عالم ہر ایک آنسو میں

اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم
ملے ہے وضعِ فلک کی بہت تری خو میں

غبار بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو
ولہ
کہ بخشے ہے جلا گردِ یتیمی آب گوہر کو

گدر جا سر سے مانندِ قلم گر ہے سرِ شاہی
نہ آساں سمجھیو پانا سیہ بختی افسر کو

کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کر و روشن
نہیں گو کچھ بھی نقشِ بوریا تو ہوگا بستر کو

چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے ای ساقی
وفا دشمن شتابی کر ذرا لبریز ساغر کو

پھرا مجنوں کا دل سنگِ ملامت سی نہ مرنی تک — بڑا ہی چاہیئے بحر جنوں میں بار لنگر کو
کیا ہم نے تو ترک مدعا کو مدعا اپنا — خدا توفیق بخشے نیک چرخ سفلہ پرور کو

وله

نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے — کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے
نہ میں فرہاد ہوں ای عشق نہ مجنونِ دل خستہ — مرا پھر منتظر بتلا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے
تری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں — نئے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے

وله

جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے — دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے
اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ — ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے
رویا میں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار — تھے جائے گل درخت مغیلاں لگے ہوئے
بارے چھٹا اسیر بلا اس گلی میں آج — ہیں تو وہ ہائے گنج شہیداں سے لگے ہوئے
بیمار کا ترے تو کھلا حال بعد مرگ — سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے
یارانِ پیش رو ذرا ٹھیرو کہ جوں جرس — ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے
رکھ سوچ کر قدم مرے وادی میں گردباد — پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے
کوئی تو میرے ناصحِ دانا سے یہ کہو — دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے
کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثلِ زلف — کانوں سے اس کے ہم سی پریشاں لگے ہوئے

وله

خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی — ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی

وله

سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے — اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا نہ تیرے جور نے شہرا کہ اب — گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو شب وہ گل رخِ خوں شمع سے — بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو — مژدہ مے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم — آشنا ہو تجھ سے اک عالم سی بیگانے ہوئے

وله

روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے — خورشید کو ہے کسبِ ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آ گیا بارے چمن میں گل | بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے
ہووے فضائے ہستیِ موہوم کا بُرا | کنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے
اُس گلبدن بغیر ہمیں سیرِ باغ میں | صوتِ ہزار کم نہیں فریادِ زاغ سے
جس دل زدے کو نغمۂ بلبل ہو بانگِ زاغ | کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشتِ باغ سے

ولہ

دیکھا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی | اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی
رخصت ای اہلِ وطن اب ہم ہیں اور آوارگی | حق رکھے بنیاد قایم گردشِ ایام کی
پانو نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ | ہر قدم پہ جان ماری ہے دلِ ناکام کی
گردشِ چشمِ بتاں کے بسکہ ساغر نوش تھے | گردشِ گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی
جب سے کھینچا لطف رنجِ فرقتِ یار و دیار | اب ہوئی معلوم محنت گردشِ ایام کی

کیوں دل پہ مرے جادو اُن آنکھوں کا نہ ٹھن جائے | جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے
پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے اُن پر | سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت | اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

ولہ

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے | خود بخود کچھ وہ کھچے اودھر اِدھر ہم رک گئے
دیر تک ضبطِ سخن کل اُس میں اور ہم میں رہا | بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تئیں دم رک گئے

ولہ

اِدھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اُتنی ہوئی جدائی | بڑھائی تھوڑی سی جب اِدھر کو بہت سی تم نے اُدھر گھٹائی
نہ ہم سے بگڑو نباہ دو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا | کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دونوں کی آشنائی

رباعی

جنت سے کہے بزم مری تو دیکھو | یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے | کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

رباعی

منہ رکھتی ہیں کیا صاحبِ تاج و دیہیم | جو خاک نشینوں کے تئیں جانے سقیم
ہم آنکھ اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف | گر خم نہ ہو ماہِ نو برائے تعظیم

باب المیم

میر

میر تخلص، نام نامی اس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے، متوطن اکبر آباد کے۔ سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انہوں نے دارالخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کے فیض صحبت سے تنظم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے، اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے، اور اس رمز کو پہچانتا ہے، کہ میر شیریں مقال ہیں، اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے، بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی، اور اس خراش سے عارض رقم کی، مراد یہ ہے کہ نا قدر دانی سے اغنیا کی، اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوا شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ کو گئی، تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچار مجبول کے محمول ہوئے، اور جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست حالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے ہیں [illegible]، کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے

نوجوان غور کیے ہیں ہو یدا ہیں۔ اب بھی جو بوجہ تمکنت معنی کا جریدہ ثقیل طبع سے ترازو کر کے وہ دکھلاتا ہے جوان اگر کوہ بوقبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر جُراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دار فانی سے عالم باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہ جہان آباد میں تھے ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے، اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور ہوا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسام نظم میں یہ صدر نشین بارگاہ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرز مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جو ان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قوم سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحب چار دیوان، خوش بندش خوش بیان ہے مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبت جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب افکار ہیں ؎

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا		چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا
اُمیدوار وعدۂ دیدار مر چلے		آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
چمن میں گل نے جو کل دعوے جمال کیا	ولہ	جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو		چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
لگا نہ دل کو کہیں کیا سُنا نہیں تو نے		جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا
بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا	ولہ	جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی گم ہے		تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

وله

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بت خانے — نگاہ مست نے ساقی کے انتقام لیا
وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو — نہ سیدھی طرح سے ان نے مرا سلام لیا
پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا — نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے — کام اپنا اس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اس کے — کار شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں — خوبی کا کام کس کے اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گل اور گل سے لے کے تا شمع — یہ حسن کس کے لے کے بازار تک نہ پہنچا

وله

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

وله

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر — یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سر پر غرور تھا

وله

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خوں ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دل غفراں پناہ کا

وله

سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی — جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یعنی

وله

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
گندی ہے لہو واں سر ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مرے پاؤں کا چھالا

دل کے جانے کا نہایت غم رہا ۔ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی ۔ ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی ۔ نالۂ شب سب کو خبر کر گیا

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آؤ ۔ نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
کاہے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے میر ۔ پایانِ کار مور کا خاک قدم ہوا
دل وداغ ہے اب کس کو زندگانی کا ۔ جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا

اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا ۔ ولہ ۔ لوہو آتا ہے جب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کئی خواہش ۔ گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ ۔ بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جو یہ دل ہی تو کیا سر انجام ہوگا ۔ ولہ ۔ تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر ۔ ولہ ۔ مذہبِ عشق اختیار کیا
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا ۔ ولہ ۔ اب جس جگہ کہ داغ ہے وہ آگو درد تھا
عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے ۔ دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

خوبی کو اُس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب ۔ ولہ ۔ ہے اس میں اُس میں فرق زمین آسمان کا

کام دل میں مرا تمام کیا ۔ غرض اُس شوخ نے بھی کام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے ۔ یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
وصفِ خط و خال میں خوباں کے میر ۔ ولہ ۔ نامہ اعمال سیہ کر گیا

جو اس شور سے میر روتا رہے گا ۔ ولہ ۔ تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں ۔ جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے ۔ ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح ۔ مرے مُنہ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خوں تجھ پہ خوں ثابت کرے گا
وصیت میر نے مجھ کو بھی کی تھی
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے
مغاں مجھ مست بن پھر قلقل مینا نہ ہووے گا
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین
اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
کس کا کعبہ کس کا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام
شیخ جو ہے مسجد میں بیٹھا رات کو تھا میخانے میں
کاش اب برقع منہ سے اُٹھا دو ورنہ پھر کیا حاصل ہے
یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے

کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا
کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا
سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا کیا
مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا
معلوم نہیں میرا ارادہ ہے کہاں کا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
یعنی رات بہت تھی جاگے صبح ہوئی آرام کیا
چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا
کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
جبہ خرقہ کرتا ٹوپی مستی میں انعام کیا
آنکھ موندے پر اپنی اُن نے گو دیدار کو عام کیا
رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا

زندگانی بھی ایک وقفہ ہے
ضعف یہاں تک کھنچا کہ صورت گر

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر

کام آنے کا نہیں ایک بھی یار آخر کار
مشت خاک اپنی جو پامال ہی یہاں اس پہ نہ جاؤ
میر گم کردہ چمن زمزمہ پرداز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں نالہ فشانی کا دماغ
گوش کو ہوش سے ٹک کھول کر سن شور جہاں
گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل

ہاتھ سے جائے گا سر رشتۂ کار آخر کار
سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
جس کی لے دام سے تا گوش گل آوازہ ہے ایک
ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل

سیر کر عندلیب کا احوال

ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

وله
دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں — وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی — کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر — ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں

وله
ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھئے کیا ہو کیا نہیں — تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر — کعبے میں جاکے بیٹھ میاں تیرا مگر خدا نہیں
گردش فلک کی کیا ہے جو دورِ قدح میں ہوں — دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے — پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں

وله
صد تمنا سے یار رکھتے ہیں — تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
پھیر کرتے ہیں میر صاحب عشق — ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں

وله
دن گذرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو — رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میں میر — یار مستغنی ہے اُس کو مری پروا کیا ہو

وله
عشق کو نفع نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب — کرے تدبیر جو یہ درد وہ دوا رکھتا ہو
ہائے اس زخمیِ شمشیرِ محبت کا جگر — درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

وله
فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

وله
یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے — مر جائے ولے اُس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے — پر دامِ محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے آہ نپٹ سرد — یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم — یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر — یہ سیرِ سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے

جو دے آرام ٹک آوارگی میر — تو شامِ غربت اک صبحِ وطن ہے

وله
عشق میں بے خوف و خطر چاہیئے — جان کے دینے کو جگر چاہیئے

باقلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیئے
شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیئے

ولہ

نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

ولہ

اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میر ہم برابر خاک — وہاں وہی نازو سرگرانی ہے

ولہ

ادا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

ولہ

گرم ہیں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

ولہ

کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طرح تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جاکے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یہاں نہیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے — اک خواہشِ دل ساتھ مرے جی کے کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعی

اب عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اُسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

دیگر

خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دیگر

اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھوؤ گے — پھر سوچ کے غفلت کے تئیں رؤ گے
کیا خوابِ گراں پہ روز و شب مائل ہو — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ		غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ	دیگر
ہے نسبتِ خاص تجھ سے ہر ایک تئیں		کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ	
تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے		خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے	دیگر
اب آخرِ عمر میر جی کی خاطر		سجادہ گرو رکھنے نکالا ہم نے	

۲ مظہر

مظہر تخلص، میرزا مظہر جان جاناں کر کے مشہور تھے۔ مشہور سخنوروں میں دلی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان، اور اندازِ گفتگو میں نادر زبان تھے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے، اور دلی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے۔ قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور، اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے، اور عشق حقیقی و مجازی سے کام۔ انعام اللہ خاں یقین اور خفیہ صاحب درد مند ان کے شاگردانِ رشید سے کہلاتے ہیں، اور میر عبدالحی تاباں تخلص بھی علیٰ ہذالقیاس اسی طرح سے گنے جاتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہفتم روز عاشورہ کو لبِ بام پہ اپنے گھر میں سرِ راہ بیٹھے تھے، اور کوئی سردار روہیلہ کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گذر شدوں کا ان کے زیرِ بام سے ہوا، اُس روہیلے نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی، اور موافق سلام سے ہوا، اور میرزائے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح بیٹھے رہے، بلکہ متبسم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمے کو ہو چکے ہوں ہر سال اُسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی خفت ہے"۔ یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شدوں کے ساتھ تھے اُنہوں نے سُنی، اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام باڑوں میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو، کہ عبادت شب دہم عاشورہ سی ہے، کوئی شخص ان کے دروازے پہ آیا، اور ان کو باہر بلوایا جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ طپنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کر کے بلوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، اور

ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اس معقلہ پرواز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلود دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار اُن کے نتائج افکار سے ہیں ❖

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا	وله	اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں ہیہات گسل میرا	وله	کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پہ ہائے دل میرا
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار	وله	ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک		جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں کہ آتی ہے بہار
مرتا ہوں میرزا سے گل ہر سحر	وله	سورج کے ہاتھ جو مری ولیا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کے تئیں مرے		یہ شیشہ بیچتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ
خدا کے واسطے اُن کو نہ ٹوکو	وله	یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں سب مجھے		ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۳ مضمونؔ

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن باج موہ کے تھے۔ باج موہ ایک قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے۔ جس ایام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہ جہان آباد میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اُترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا پھر وہیں رہا ہے۔ اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ ازبسکہ شیخ مذکور علت سے نزلہ کے منہ میں ایک دانت

سلہ کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے۔ عاش حمیداً مات شہیداً لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی کے ہیں ٭٭

نہیں دھرتے تھے، تو خان آرزو انہیں شاعر بیدانہ کہا کرتے تھے۔ دلی میں نظمِ وجود کو انہوں نے ناموزون بوجھا ہے، اور مضمونِ عالی انہیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے ؛

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو رکھے ہیں انکا		کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے	ولہ	دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا
نہیں ہے زاہدوں کو مے ستی کام	ولہ	لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سرکا
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں ای محبوب کیا	ولہ	صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا
کوچے میں بیوفا کے مارے گئے ہیں عاشق	ولہ	نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جینا
ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب	ولہ	نہ لاوے تری حسن کی ماہتاب
جس طرح سے رہے ہے مال کی اوپر کالا	ولہ	یوں رہی زلف تری مُنہ کے اوپر مار کے پیچ
اگر ہی دار ہے کامل کو سرتاج	ولہ	ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج
ایک تو تھا ہی وہ مہ رو خود پسند	ولہ	ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دو چند
تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر	ولہ	چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر
تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر	ولہ	آب پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال
کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ	ولہ	جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہی چل بچل
احوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا	ولہ	آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا
شرم سے پانی ہو جاویں رقیب	ولہ	جو مرا یوسف ملے آ چاہ سے
وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووے بانکا	ولہ	خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں
کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں	ولہ	جانتا ہے خوب وہ مضمون کو
اُس وہاں پیچ سخن رکھتا ہوں	ولہ	مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو
جب سے چاہا ہے ترا چاہ ذقن	ولہ	آب چشموں سے مرے جاری ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں	ولہ	گذرتا ہے مجھے یہ چاند خالی
چلا کشتی میں جب آگے سی وہ محبوب جاتا ہو یہ اشک آنکھوں میں قاصد کس طرح یک دم نہیں تھمتا	ولہ	کبھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے دل بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے
مرے آئینۂ دل سے ترا نقش	ولہ	جو دیکھا تو کسی صورت نہ جاوے
مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سُن رقیب	ولہ	غصے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

۲۸ مخلص

مخلص تخلص، مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے، ساکن مرشد آباد. میر باقر کرکے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگالے میں بہت کیفیت کے ساتھ انہوں نے گذری ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقفِ احباب گردشِ صراحی اور لب جام تھا۔ زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرتِ عیش سے ازبسکہ دھیان رہا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی لغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۷ھ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دام ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیر چمنستانِ عدم کی عین تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں ٭

مد بسم اللہ ابرو سے ہے رخ عنوان کا اب تلک تو اُس کو آکے جفا کار دیکھنا	ولہ	حُسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھنا
ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہوگا بدی میں یاں تلک مشہور دنیا سے مرا مخلص ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے	ولہ	میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہوگا پھر اُس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہوگا کیوں کف پا ہیں ترے رنگِ حنا سے آشنا

یہ پوچھ خضر اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف	ولہ	حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا
ترکِ اُلفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا	ولہ	ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا
مخلص کیا دریافت ہیں سنگ محک سے	ولہ	جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا
آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا	ولہ	جز نالہ کوئی اُس کی فریاد کو نہ پہنچا
ہو گئے داغ نمک داں مرے اے کانِ نمک	ولہ	جب ستی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ
اگر یاد کر پیوے لب کو ترے	ولہ	نہ ہو مست کو یہ خمارِ شراب
زخمِ دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا	ولہ	باقی رہتا جو کوئی تار گریباں کے بیچ
گئے یہ بال و پر برباد صیاد	ولہ	قفس سے اب نہ کر آزاد صیاد
دیکھیو نرگس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں	ولہ	دور سے آنکھیں خزاں کو تئیں دکھاتی ہے بہار
دل خستہ و سودا زدہ تدبیر سے ہے نازک	ولہ	دیوانہ زبردست اور زنجیر ہے نازک
محبت میں تری جا کر پھنسا دل	ولہ	دریغا ہائے دل وا حسرتا دل
تھی یہ خوشی کہ ہو گا مرے دل کا غم تمام	ولہ	وہ تو ہوا نہ کم پہ ہوئے آہ ہم تمام
کیوں عبث میں علاج داغ کروں	ولہ	خانۂ دل کو بے چراغ کروں
کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوے ہائے لہو	ولہ	داغ ایسا نہیں کوئی دل میں کہ ناسور نہیں
منظور بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں	ولہ	میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی سو نہیں
ملی جب خواب سے اُٹھ آنکھ تو تے صحنِ گلشن میں	ولہ	شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں
کیوں کیا جھاڑ کے نوبت غبارِ دامن	ولہ	کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بارِ دامن
نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھو تو نے	ولہ	تجھے صد آفریں صیاد یوں ہی صید کرتے ہیں
جن کو دولت ہے شہادت کی تمنا مخلص	ولہ	تیغ بیداد کو وہ بال ہُما کہتے ہیں
گرم جوشی ستی مخلص سے ملے ہے جب یار	ولہ	رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں
ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں	ولہ	ہمیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تھم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں	وله	جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں
روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں	وله	شرم سے اپنے میں جیسے کہ مُوا جاتا ہوں
اُس کے یہ ظلم و ستم کچھ نہ کہے جاتے ہیں	وله	نہ ہمیں چھوڑے بنے ہے نہ سہی جاتے ہیں
کہتا ہے تو جو ہر دم شمشیر سے ہے اودیں ہوں	وله	یہ طشت ہے اور سر ہے تقصیر ہو ادیں ہوں
مخلص ترے کے یار بہت ہیں گے مشتری	وله	تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو
آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے	وله	دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے
عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے	وله	جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے
قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں	وله	ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے
مرے دل میں آنا بسا آکے تو ہے	وله	کہ مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے
ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے	وله	مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے
دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے		آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے
یہ مشت خاک اُڑ جاتی ہو جب ملنے کو مجنوں سے	وله	بگولے آگے آتے ہیں اُسے لینے کو ہاموں سے
کیوں کہ ہووے گی زندگی اب آہ	وله	دل کی نوبت تو جان پر آئی
نہیں یک دل سلامت اس میں پایا	وله	شکن اُس زلف کی کیا دل شکن ہے
چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی	وله	نہال و گل نے کہا مدظلہ العالی
ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلہ سے جل نہ جائے	وله	عاشق کی خاک پر نہیں آتے میاں کبھی
کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے	وله	قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیاد کو پہنچے
سحر روتے لہو اور کرتے شام آہ رسا گذری	وله	کبھی تو نے نہ پوچھا آہ مخلص یہ کیا گذری
مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا	وله	اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا دے
رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ	رباعی	کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ
تمہید نہیں اتنی بھی ظالم درکار		مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

ناصح میں عجب دیکھی مروت تیری — ایضاً — عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا — جو اس میں سماوے یہ نصیحت تیری

۵-مجذوب

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہجہان آبادی۔ بیٹا سرتاج شعراے بلند مقام میرزا رفیع سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، دردِ دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، اور حسن ترکیب میں ناظم رنگیں بیان۔ تلاش سے معنی تازہ کے حتی الامکان نہیں گذرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامینِ مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انہوں نے کہے، اور مقدور بھر سرانجامِ جواب سے غافل نہیں رہے غرض بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ساتھ عسرت معاش کے لکھنؤ میں جیتے ہیں مصرع لختِ دل کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں + یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے +

خوباں سے جو دل ملا کرے گا — دھڑکا ہے یہی کہ کیا کرے گا

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہو وے تو میں جانوں — ولہ — بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہووے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی — تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہووے تو میں جانوں

آوے ہے مسیحا مرے بالیں پہ تو کیا ہو — ولہ — بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے — ولہ — یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر — صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے

۶-مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے، بندش نظم میں اس کے ایک صفائی اور شیرینی ہے، اور معنی

بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہ جہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے ضیقِ معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر درہم برہم اُس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے:

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف		بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خواب صبح
ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر	ولہ	چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامنگیر
سمجھ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر		مبادا ہو کوئی تیرا شرار دامنگیر
آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز	ولہ	ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز
ایک دن رو کے نکالی تھی وہاں کلفتِ دل	ولہ	اب تلک دامن صحرا ہے غبار آلودہ
زبس آئینہ رو ہے طفل حجام	ولہ	نہیں بن دیکھے اُس کو دل کو آرام
جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری	ولہ	بنا خورشید پانی کی کٹوری
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا		اُسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینہ کو ایسا نائی		بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے نامۂ مو اُس کی تمثال		کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفیؔ اب تو بھی فی الحال		منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۷۔ محبت

محبتؔ تخلص، نواب محبت خاں نام۔ خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں، حسب و نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں۔ جوان خوش ظاہر خوش رو ہیں، اور خوش اختلاط و خوش خو حُسن خلق سے معمور، اور مروت و جوانمردی کے ساتھ

مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انہوں نے شیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ سسی پنو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسین بہادر کے انہوں نے نظم کیا ہے، اور نام اس مثنوی کا اسرار محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اُسی ایام سے بس طور بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اُسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامین تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں ٭

جب تلک وہ بت خود کام نہیں آنے کا — دل بیتاب کو آرام نہیں آنے کا
مجھ کو خطرہ ہے خدا یہ نہ کرے جو اس کا — دیوے قاصد کہیں پیغام نہیں آنے کا
کیا خوشی کیجیے یارو کہ وہ خورشید لقا — صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

وله
کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا — یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستمگاری کا
دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا — کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا

وله
قید ہو بیٹھے ہو دونوں جہاں سے آزاد — میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

وله
دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک — میر اغبار کیجو برباد اس طرح کا

وله
مذکور جو محفل میں ہوا دوش کسی کا — سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا

وله
شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا — تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

وله
جس گھڑی گلگشت سے تو جلوہ فرمانے لگا — غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا
یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ ناصح دل ہوا — تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے	وله	آج چہرا مرا بحال ہوا
تیری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا	وله	عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
تو اُس کے گھر کو تو ہنستا ہوا چلا اے دل		یہ ہے وہ قہقہہ دیوار جو گیا سو گیا
دل جو جاتا ہے چلا جاے کہیں مجھ کو کیا	وله	اُس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
چشم حیراں سے کہاں دل کو ملے لذت دید		مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
منزل اوّل ہی ابھی عشق کی اے تاب و تواں		چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا
دل دیں گے رونمائی دستور ہے ہمارا	وله	کیا کیجیے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی		یہاں تک وہ بت غیور مغرور ہے ہمارا
جاتے ہیں جلد پھینکے توسن کو عمر کے ہم		کیا کیجیے محبت گھر دور ہے ہمارا
غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے	وله	بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول
دید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں	وله	اُڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانے میں
دل خشک ہے کہاں سے ہیں اشک چشم سے		فوارہ تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں
نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں	وله	دم میں دم جبتلک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیروں کو چپ چھپ کے رقم کرتی ہیں		یہ جو جھوٹ ہو وے تو ہم بات قلم کرتے ہیں
سرخیِ اشک کبھی اور کبھی زردیِ رو	وله	تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے	وله	تو اُٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھ کو
ساقی گھٹا ہمیں جو برستی نظر پڑی	وله	یاد آئی مے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ جنس ہائے		اُس کو متاعِ دل مری سستی نظر پڑی
یا تھا فلک پہ اُس کا دماغ اب ہے خاک پر		دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی
تمنا یاس ہے ہیہات کہنے میں نہیں آتی	وله	غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمہارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آپ کے دیکھ چکے سب سے اشارے ہم تو
آ لگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ساری شب رہتی ہی مجھ میں اور دلبر میں خوشی
لیک حرف ناز اس کا سن نہیں رہ جی میں جی
وله گر اسے میں جام بھر بھر دوں ہوں وہ مجھ کو کبھی
چھیڑتا ہوں جب میں اس کو تب یہ کہتا ہی ابھی
پاس سے ہم تیرے ان باتوں سے اب اٹھ جائینگے

مثنوی

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات
تو مضموں کر کے اس قصہ کا معلوم
اگر ضائع نہ ہووے اس میں اوقات
یہ ہی منشور کر تو اس کو منظوم
یہ بات اتنے لئے تجھ سے کہی ہی
تجھے اس عشق کے ہیں کار معلوم
کہ مشق اس کی بہت تجھ کو رہی ہے
محبت کے ہیں سب اسرار معلوم
پیا ہے تو نے بھی جام محبت
سراپا تو ہے ہم نام محبت
ترے اشعار سن کر سب سخنداں
محبت کا اسے کہتے ہیں دیواں
سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا
عیاں یوں ہوئے سے تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

وو پٹا چاند تارے کا زری باف — جو اوڑھے تھی گرانی پٹیاں صاف
سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر
گندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اُس میں مسکن — اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
نگہ بدرِ فلک کی اُس جبیں پر — اک ابرِ سیہ جیسے ہو مُنہ پر
وو دندان آب دار اُس سیم بر کے — کہ سوراخ اُن سے ہیں دل میں گُہر کے
کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر — قیامت اُس پہ تھی مسّی کی تحریر
تبسّم میں نظر اس رنگ وہ آئے — کہ غنچہ جیسے نافرماں کا کھل جائے
زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر — سخن ہو جائے گم میری زباں تک
گوئے کیا کیا جھکاوے عشق اُس آہ — جیسے چاہِ زنخ کی اُس کے ہو چاہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دار ہوتی
حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ — کہ جوں خوش خط لکھیں سُرخی سے اللہ
بھلا دوں کس سے نسبت ان کچوں کو — جو میداں حُسن کے سے لے گئی گو
عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں — کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے اُنھیں نامردِ ذاتی — عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی
جو وصف اُس ساقِ سیمیں کا سنے ہے — بہ حسرت شمع رو رو سر دُھنے ہے
قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے — اور اُس کے فندقِ پا تک نظر آئے
تو حیرت سے ہوں یہ سب کو پہ دیکھے — بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت — کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہو ٹک فرشِ گل پر گرم رفتار — رگِ گل پشتِ پا سے ہو نمودار

۸ ۔ منت

منت تخلص، میر قمرالدین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ سلسلہ ان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے۔ وہ سید جلال جنے بیٹے تھے سید عضد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرہ کاشی میں لکھا ہے۔ قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے، اور کیفیت راہ طریقت و معرفت کی فخرالعارفین مولوی فخرالدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اُٹھائی ہے۔ عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نورالدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دیقیقے سستی و چستی نظم کے طے ہوئے۔ صفائی بندش و حسنِ بیان میں فی الحقیقت اُستاد، اور موشگافیِ معنی میں قلم اس کا رشکِ خامۂ بہزاد۔ زبان فارسی میں کلکِ عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ بیت کے کلیات ان کا ہے۔ مثنویاں متعدد انہوں نے کہیں، اور کتابیں بیشتر تالیف کیں۔ چنانچہ شکرستاں کر کے ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستاں کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ سنہ ۱۱۹۱ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانیِ شاہ جہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کی سبب مشتاق ان کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسنین بہادر کی سرکار میں توسل انہوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے آ کر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہشٹن جلاوت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق مہاراجہ نکیٹ رائے کے ہوئے، اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ نکیٹ رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمرالدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی۔ چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا،

اور تاریخ تخیز قیامت وہی سکن ہوا۔ یہ خلاصۂ افکار اس منتخب روزگار کا ہے +

خشک نالے ہوگئے بہنے سے دریا تھم رہا | چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا

مے کدہ سے ٹل گئے اہل ہوس پی پی کر جام | انگبیں وہ ہوں کہ اس پیر مغاں میں جم رہا

ولہ

کوتہی اس کی زلف سے دست صبا ہنوز | عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

ولہ

گل نکلتے ہیں زمیں سیتی برنگ شعلہ | کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

ولہ

گر نقش دوئی مٹائیں گے ہم | سچ کہیو کہ کیا کہائیں گے ہم

مصری سے وہ ہونٹ ٹک دکھاوے | کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم

اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے | ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا | کیا اب تمہیں منہ دکھائیں گے ہم

ولہ

سو کوہ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں | کچھ عاشقی نہیں ہے ہم جی پہ کھیلتے ہیں

دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم | اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں

خوان کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم | ہم بے نصیب اب تک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

ولہ

منت ایسے کو دل دیا تو نے | اے مری جان کیا کیا تو نے

ولہ

مدعی اس سے سخن سازیہ سالوسی ہے | پھر تمنا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے

ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے | اے حنا کس کی تجھے خواہش پابوسی ہے

تہمت عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منت | ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خو سی ہے

ولہ

کوئی اس بد مزاجی پر تمہارے پاس کیا بیٹھے | ادھر ٹک ہم نے دم مارا ادھر تم منہ بنا بیٹھے

یہیں سے ہمرہان قافلہ اپنی تو رخصت ہے | کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقش پا بیٹھے

قطعہ

کھڑے رہتے جو اس کی بزم میں تو یوں لگا کہنے | دکھاتا ہے یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کھڑا بیٹھے

جو اتنی بات سن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے | ہنسی سے کہتے ہی اک بات کے بن آپ آ بیٹھو

نہ آوے باز یہ بندہ تو منت بد کہانے سے | تکلف برطرف گر ساتھ اس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو غرض غم دل رو سے ہے	ولہ	گرہ زیر لب غنچۂ آرزو سے ہے
قدم رکھ گیا کون سینہ پہ اپنے		گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے
سناتا تھا میں حال دل اس کو منت		کہا چل بے بیاں سے یہ کیا گفتگو ہے
آہو سے تری چشم کی کب چھوڑیں یہ تشبیہ		جب تک کسی ساغر کو تو آنکھیں نہ دکھاوے
اُٹھ جائے کسی کے جو دل صاف سے پردا		پھر آئینہ دنیا میں کبھو مُنہ نہ دکھاوے
بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام	ولہ	کیا سنگ سے دل شیخ کا اللہ سے پاوے
منت یک بار عشق سے توبہ کر	رباعی	چار و ناچار عشق سے توبہ کر
اب تک مردود دین و دنیا رہنا		آ جانے دے یار عشق سے توبہ کر
منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے	دیگر	روکا کب غم کا ولولا جاتا ہے
کیا جانئے کیا خلش ہی سینہ میں آج		ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے
منت ای جان ان بتوں کو مت پوچ	دیگر	مت کھوا ایمان ان بتوں کو مت پوچ
ان باتوں پر پتھر پڑیں تیری ظالم		اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوچ

بابُ النون

۱۔ ناجی

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے، اور بطور قدما کے طرز ایہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا، اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے، اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے لیکن ازبسکہ غیر مروج طرز ایہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوس قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھوان کا	شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر کر آسمان کا

نہ پوچھو خود بخود عارض خورشید کی خوبی | ولہ | لیا ہے داد حسن ماہ مہ رویوں سر کر چندہ

مجھ کو باتوں میں لگا معلوم نیں کیا کیا گیا | ولہ | لے چلا جی کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

تری نگاہ کی کثرت سے اسے کماں ابرو | ولہ | ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیروں کا

مت گرفتار و دام زلف سے دل | ولہ | بال باندھا غلام ہے تیرا

سخن سن اُس بت کا فرادا کا | ولہ | جیا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف | ولہ | ہوش کھو کر آدمی بھولے ہیں اپنی خورد و خواب

دی سے دریا اوپر مجھے مجھی | ولہ | لا اُتارا ہے میں اُسے کس گھات

محبت سوں علیؑ کی دیکھ ناجی | ولہ | ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد

یکبار جو بغل میں لوں اُس سرو قد کے تئیں | ولہ | بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں

عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں | ولہ | برسات میں اُتار رکھے ہر کماں کے تئیں

زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم | ولہ | مکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو

ہی غرض ملنے میں نہ اُلفت کچھ اس بے درد کو | ولہ | پوچھتا ہے کانِ زر عاشق کے رنگِ زرد کو

غم نہیں گر دلبری سی دل کو لے جاتا ہے وہ | ولہ | پاس میرے تب تو آتا ہی جو دل پاتا ہی وہ

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہی | ولہ | یہ تو طالب زر کے ہیں اور یہاں خدا کا نام ہی

وظیفہ راگنی کے سُر میں زاہد کفر ہے مت پڑھ | ولہ | نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہی

ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسا | ولہ | جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہی

انا الحق بولنے لگتا ہی اُس کے زخم کا بسمل | ولہ | کٹاری آبدار اُس شوخ کی منصور خانی ہی

اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں | ولہ | عارضی میری زندگانی ہے

تصور سی ترے رخ کے گئی ہی نیند آنکھوں سے | ولہ | مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اُس کو خواب آوے

۲- نعیم

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام یہ وطن شاہ جہان آباد کا معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر شاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئی ہیں، اور مکرر غزلیں انہوں نے باہم لڑائی ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہے	بدتر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دورہ پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انہوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے	لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلی نہ چھوڑی، اور شاہ جہان آباد ہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اس کہن اُستاد سے ہے۔ یہ اس کے طبع زاد سے ہے ؎

اس وقت تک اے یار و گفتار نہ کیجے گا		اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجے گا
احوال سرِ اُس کے کہنے لگا وہ ظالم		اب جائیے بس زیادہ تکرار نہ کیجے گا
خیال کر کے ترے مو کمر کو روتا ہوں	ولہ	وہ کیوں نہ رووے پڑی جسکے بال آنکھوں میں
دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور	ولہ	تجھ سے تو جہاں میں بھی دلدار بہت ہونگے

باب الواو

۱- ولی

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی۔ وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے۔ شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے۔ اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع

واقسام کا اُٹھایا۔ خوب خوب داد تلاش معنی کی دی، آخر اس بیتِ بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سر بلند افکار کے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں ٭

پھر میری نبض لینے کو عیسیٰ وہ نہ آیا		شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں	ولہ	کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں		تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا
گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا	ولہ	ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا
صحنِ گلشن میں جب خرام کیا	ولہ	سروِ آزاد کو غلام کیا
پھرتے ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے	ولہ	بن بند اُن انکوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامہ کے اوپر		دامن کو ترے ہاتھ لگا کون سکے گا
جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا	ولہ	عالم میں اُس کا نانوں جواہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہی جس نے دل		وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا
خدا نے منہ پہ ترے بابِ حسن باز کیا	ولہ	قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا
تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا	ولہ	سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا
حُسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد	ولہ	طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو		دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں		درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ
شغل بہتر ہے عشق بازی کا	ولہ	کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثل شانہ مدام		ذکر تجھ زلف کی درازی کا
دل صد پارہ تجھ پلک سوں بندھا	ولہ	خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا
آیا ہے نقل لینے ترے منہ کی تاب کی	ولہ	تار خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی
بجا ہے گر شہیدِ سرو قد کو	ولہ	بنادیں چوب سے طوبیٰ کی تابوت

وله
نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف
ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دکان آج

وله
کیا ہے دفع مرے دردِ سر کو رونے نے
ہوا ہے حق میں مرے خون دیدہ صندلِ سُرخ

وله
رحم بے جا ستم برابر ہے
تو رقیباں اوپر کرم مت کر

وله
جو آیا مست ساقی جام لے کر
گیا یکبارگی آرام لے کر
میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ
جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر

وله
میں نہ جانا تھا کہ تو نادان ہے
دل دیا تھا تجھ کو دانا بوجھ کر

وله
ہوں گرچہ خاکسار دلے از رہِ ادب
دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز

وله
لبِ دلبر پہ جلوہ گر ہے خال
حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال

وله
صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلّم
رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

وله
نہ جا آنکھوں میں۔ آ بچھ دل میں اے شوخ
کہ ہے خلوت میں اُس کی خوفِ مردم

وله
ٹک ولی کو صنم گلے سے لگا
تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم

وله
اُس کی دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے
صنعت سے ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں

وله
خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں
بے تکلف صفحۂ کاغذ یدِ بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ عریاں کے حضور
خود بخود رسوا ہے اُس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا
جامہ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب
زیورِ لب ذکرِ سُبحانَ الَّذِی اَسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولی
سروِ قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں

وله
یک بار اگر بات مری گوش کرے تو
ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
غیرت سے کرے چاکِ گریبانِ دلِ پُرخوں
گر گل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے
ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو

وله
ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج
اُس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قداں دل کو بند کرتے ہیں ولہ نام اپنا بلند کرتے ہیں

اے ساحری تو دیکھ مری ساحری کے تئیں ولہ شیشہ میں دل کو بند کیا ہوں پری کے تئیں

صحبت غیر میں جایا نہ کرو ولہ دردمندوں کو کڑھایا نہ کرو

اک دل نہیں آرزو سے خالی ولہ ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

کیونکہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے ولہ عاشقی میں لباس ہوتا ہے

رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں ولہ وفاداری ہماری اس قدر ہے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن ولہ باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں دامِ دل زلفِ دوامی پوش ہے

نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے ولہ جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے ولہ عشق کا اعتبار کھوتی ہے

ترا منہ مشرقِ حسنِ انوری جلوہ جمالی ہے ولہ لبیں جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے ولہ چمن حسنِ پریرو کا تماشائی ہے

گلِ رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندرِ طالع جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے

شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے ولہ زخمی ہو شکار کیونکہ جاوے

چھوڑا اے شوخ طرزِ خودکامی ولہ مت ہو ہر دیدہ باز کا دامی

جب تک نہ ملے شرابِ دیدار ولہ آنکھوں کا خمار کیونکہ جاوے

تجھ لب و زلف کے تماشے کو ولہ چل۔ کہ آئے ہیں مصری و شامی

۲۔ ولی

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے بھتیجے ہیں شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اُس خجستہ کردار کا کہ "جوانِ آزاد حال اور دوست ہے اس خاکسار کا۔ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبان ریختہ میں انھوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔" یہ منتخب افکار اُس ستودۂ اطوار کا ہے۔

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا
یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا

ولہ
دل تجھے منظور ہو اُس کا اگر دیکھنا
جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا
زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی
ملتی ہے آپس میں اب شام و سحر دیکھنا

ولہ
آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا
میرے اس نخل میں ثمر نہ ہوا

ولہ
بےکسی پر مری کہے کوئی
تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا

ولہ
صحبتِ نیکاں کرے دل میں بدوں کے گیا اثر
قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ
کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی
ہو گیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ

ولہ
تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز
ہم تب سے ہاتھ پر لئے پھرتے ہیں سر ہنوز
آنکھیں بھی انتظار میں پتھرا گئیں ولی
قاصد پر اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز

ولہ
میری زبانِ تر سے نہ ہو تازہ کام خشک
کب سیر آب تیغ سے ہووے نیام خشک

ولہ
کبھی جو زلف اُٹھاوے تو منہ نظر آوے
اسی اُمید میں گذری ہے صبح و شام ہمیں

ولہ
زندگی کی اُس نے کچھ لذت ولی جانی نہیں
جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبر جانی نہیں

ولہ
چاہے کیونکر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو
پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

ولہ
عیاں گر کروں دل کے سوزِ نہاں کو
لگے آگ جوں شمع میری زباں کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے		ہما کھاوے بسی کر اگر استخواں کو
حد سے زیادہ رشتۂ اُلفت ہی مختصر	وله	ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ
ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شبِ تار مجھے	وله	کب دکھاوے گا خدا صبحِ رخِ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر کیا تو نے صیاد	-	زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے

جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے	وله	وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہِ گرم سے پری رو کے		شیشۂ دل مرا گداختہ ہے
جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے	وله	اُسے ہر دو عالم فراموش ہووے
بندِ قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے	وله	لے برگِ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

بابُ الہاء

۱- ہدایت

ہدایت تخلص۔ شیخ ہدایت نام اس مرد کا ہے۔ شاہ جہان آبادی۔ معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انہوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے۔ اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے، اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں طبع زاد سے اس کے ہے، اور گم شدگانِ راہ معنی کو بیشتر ہدایت اس کہن اُستاد سے ہے۔ یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام کا ہے +

جب لوں ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہے آنسو		جس طرح کہ سمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا	وله	غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا
جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بہ گریباں	وله	ہے منہ میں زباں پر نہیں مقدور سخن کا
نہ رحم اُس کے ہے جی میں نہ دل میں ہے صبر	وله	ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا
ہوگیا ہوں میں زرد جوں خورشید	وله	ظاہر وقت ہے اخیر مرا
تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا	وله	نہ خلف وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا

بلا ہی زور ہے اس دختِ رز کا ای ساقی
خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا

ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے
اگرچہ آئینہ تھا دل پہ ہم سے چھوٹ گیا

ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں
کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

ولہ

آتش سے داغِ دل کی سراپا میں جل گیا
گلزار ہووے کیا کہ بدن سارا پھل گیا

رووے ہے کیا جوانی پہ اپنی کہ بے خبر
شب کیا گذر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا

لب پر ہزار حرفِ شکایت کا تھا ہجوم
مکھڑے کو دیکھتے ہی پہ کچھ دل بہل گیا

ولہ

ہر لختِ دل سے گلے کا مرے ہار ہو گیا
گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا

ہے کس کے جی میں خواہشِ سیرِ چمن یہاں
سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا

آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں
یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں
میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا

کچھ ان دنوں ہے حال ہدایت ترا تباہ
کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا

ولہ

عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا
جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا

جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے
کیا جانئے کہ کس نے فراموش کر دیا

مجلس میں اُس کی رات ہدایت نے سوزِ دل
یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا

ولہ

نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا
مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک
پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے
منہ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا

آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بو نسیم
رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں
راتوں کو اپنے پاس وہ گل فام رہ گیا

مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں
آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا

ولہ

اک دن بھی مہربان نہ وہ بے وفا ہوا
اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا
نہ صحنِ باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں
دیکھ اُس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا
دیکھا نہیں سے ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں
عشق میں خوباں کے سے ہے طرزِ ستمگاری بہت
مار ڈالا ہند کے کافرادائوں سے نے ہمیں

ولہ — دسلے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا
ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا
ولہ — بس میری جان دو ہی پیالوں میں چھک گیا
شاید کسی جگہ یہ دل اُس کا اٹک گیا
ولہ — آہ دلداری ہے کم یہاں اور آزاری بہت
حُسن میں ان کے نمک اور طرحداری ہے بہت

نہ ملے کارواں سے ہم اسے واے
یار ہے ہم ہیں ہدایت جلوہ گر
پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات
دل تو سمجھا سے سمجھتا ہے کبھو
کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب

ولہ — گرچہ کتنا جرس پکار رہا
ولہ — جس طرح ہو گوہر یکتا میں آب
آب میں دریا ہے یا دریا میں آب
ولہ — روتے روتے ہی گذری ساری رات
ولہ — پر ہدایت چشمِ تر کا کیا علاج
ولہ — یارب کیا آج سو گئی صبح

تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا
قیس ودوں مرگیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی
تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو
عصا لے ہاتھ آئی سُن تجھے گلشن میں آئی ہے
چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسمی
کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سی
کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی
سیرِ چمن ہوا و مے و صحبت و طنبور
گلشن کو دوستی کے میں دیکھا چمن چمن

ولہ — ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم
آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یار تھے ہم
ولہ — اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو
ولہ — یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے
ولہ — سچ کہیو ہم سے رات پیارے کہاں رہے
گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے
ولہ — پر چشم تجھ سے ہائے مجھے یہ صبا نہ تھی
ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی
جز بوئے خونِ دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا ہیں جوں نقش قدم تو کیا ہوا | ولہ | گردباد آسا مری طینت میں ہے آوارگی
ہوئے جب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دیدہے | ولہ | ل گئے جس دن گلے تیرے اُسی دن عید ہے

دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے | ولہ | گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں | | چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے
دل نہ کر تو شکوۂ جور بتاں | | فائدہ کیا یار اس مذکور سے
گر نت یہی جور اور جفا ہے | ولہ | بندے کا بھی اے بتاں خدا ہے
غرض یہی ہی مجھے اشک کے بہانے سی | | کہ مہرباں ہو وہ یارب کسی بہانے سے
برنگ اشک اُسے آبرو ہی دنیا میں | | جو اپنے گھر میں ہی محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہی یہی | | وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص | | الٰہی اُٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثل حلقۂ در | | یہ سر لگا ہے مرا اُس کے آستانے سے
آنکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہے | ولہ | وہ شور قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد | | اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر | ولہ | یاد میں زلف و رخ یار کے کیونکر گذری
دن گذرتا ہے مجھے روز قیامت سے دراز | | رات گذری تو شب مرگ سے بدتر گذری
پختہ مغزان جنوں سے ہر کسی کو جنگ ہے | ولہ | جو ثمر پکا سو پامال جفائے سنگ ہے
عشق نے تیری مجھے یاں تک کیا ہی ناتواں | | تا بہ لب آنا نفس کو راہ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہی زرد سا | | ظاہرا عاشق کسی پر ہی ترا کیا رنگ ہی
صدقے ترے گلعذار جی سے | ولہ | اک جی سے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت | | نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے
گھر سے نکلے ہی تو جی ساتھ نکل جاتا ہی | ولہ | کوئی قامت ہی کہ یہ آہ دل محزوں ہی

زلفِ کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے	ولہ	کیا یہ صید ہے نکلتا تھوڑی ہے
چشمِ خوں سے ہے دامنِ دریا		آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے
شاخِ گُل خم نہیں کسو نے کیا		ہاتھ معشوق کے مروڑی ہے
عمر کوتاہ کارِ عمر دراز		سانگ ہے، بہت رات تھوڑی ہے
ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے ورنہ	ولہ	وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے
ہیں خوب سیر کی جگ میں ہر ایک بستی کی	ولہ	بنا خراب ہو بنیاد بت پرستی کی
ہمیں نشیب و فرازِ زمانہ سے کیا کام		جو سر بلند ہیں اُن کو ہی فکر پستی کی
جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا	ولہ	کس کی مجلس سے ہم اداس گئے
جب سُنا میں نے غم ہدایت کا		سُنتے ہی بس مرے حواس گئے
جاؤں نکل میں دشت میں یا شہر میں پھروں		کوئی ایسی شکل ہو دی کہ ٹک جی بہل سکے
شہیدِ تیغِ ابرو ہی اسیرِ دامِ گیسو ہے	ولہ	ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہد اشکستہ ہے
ثابت کوئی اپنے جسم و جاں سے نہ پھرا	رباعی	یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا
کوچہ تو ترا رہِ عدم سے نہیں کم		جو کوئی گیا سو پھر وہاں سے نہ پھرا
دلِ عہدِ شباب ہو چکا ہے باقی	رباعی	پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہے باقی
ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور اب آخر		شب گذری ہے روز رہ گیا ہے باقی

بابُ الیاء

یقین

یقین تخلص، انعام اللہ خاں نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا اظہر الدین خاں، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا۔ شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کا مشہور اور منظورِ نظر مرزا مذکور۔ اکثر یہ گمان باشندگان شاہ جہان آباد تھا، کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا۔ مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے، اور نام اس کا داخل اشعار

کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہد سلطنت میں بسبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اُس عمل شنیع کا گذرا تھا۔ اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں۔ یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اُس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے، اور یقین گمانوں کا بالکلیہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہر حال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے، اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آبدار اُس کا خلاصہ افکار ہیں ◆

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانے کی کام آتا — اگر سنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا

وله

میں تو ظاہر نہ کروں اُس کی جفا کو لیکن — چھپ سکے کیونکہ یقین زخم نمایاں میرا

وله

مجھے گر حق تعالیٰ کار فرمائے جہاں کرتا — بتوں کو میں بہ زور ان بیکسوں پر مہرباں کرتا

نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصر شیریں میں — جو میں ہوتا بجائے شیر جوئے خوں رواں کرتا

اگر مرکر نہ میں اُس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا — خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا

زباں فولاد کی ہوتب جواب کوہکن دیوے — ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا

وله

نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذرا — ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گذرا

برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے — خدا جانے مری صورت سے بتخانہ پہ کیا گذرا

یقین کب میرے سوز دل کی داد کو پہنچو — کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گذرا

وله

ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا — اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سی کیا ہوگا

وله

اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی — تماشا ماہ کنعانی کا اُس کو خواب ہو جاتا

وله

سر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا — ہمیں ظل ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

مرا دل مر گیا جس دن سی نظارہ سی باز آیا — یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا

وله

تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا — باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہی زنداں کی ہوا

ولہ
نہ آبِ تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر ملا سکتا — تو ایسے رنگ سے کب نقش شیریں کو بنا سکتا
یہ عشق شرشکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — وگرنہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

ولہ
تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا — یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا

ولہ
یہ دل ایسا خرابِ کوچہ و بازار کیوں ہوتا — اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا
تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھو ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا
یقین اُمید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے — اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

ولہ
گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے ٹپکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
نہ کہتی راز دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی — فضیحت کرکے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

ولہ
کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند — برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

ولہ
دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک — دیکھا سو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

ولہ
اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا — جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
حسن کا عشق زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا — ورنہ وہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا
دل مرا عشق کے دھڑکوں سی مؤا جاتا ہے — یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

ولہ
اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا — ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا
ناصح جو یہ نصیحت بیجا ہے میں سنی — معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

ولہ
خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اُس کو بھی کیا شعور نہ تھا

ولہ
تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانہ سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

ولہ
بتاں کی مجھ سی خاطر جمع ہی یہاں تک کہ کہتی ہیں — کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہی کیا قدرت
ہمارا شور سن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی — کوئی شیر دل کے منہ پر نے بجا سکتا ہی کیا قدرت

ولہ
شیشۂ دل کے تئیں اپنی سنبھالے رکھ یقیں — پھر کرے گا کون اُس کی پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح — زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح
جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھو آتی ہے یاد — وہ قسم کھا کر اسی ساعت مکر جانے کی طرح

ولہ
خار سے مژگاں کی جی ڈرتا ہے میرا بے طرح — رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا بے طرح
فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیں — اک پہ چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح

ولہ
گرچہ شیریں ہے شیخ کے ہے وجد میں آنے کا شور — پر قیامت بانگ ہوتا ہے مے خانہ کا شور
آہ و نالہ پہ نہیں موقوف شہرت عشق کی — کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور

ولہ
دل یہیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر — پھر نہ دی ہم کو کسی نے اس دیوانے کی خبر
بلبلیں سہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف — کچھ تو اڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر
نیں پہنچتا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک — کون لے اس ناتواں کی اب دوانے کی خبر

ولہ
توقع دے کے مت کہ ناامیدی کی سخن بس کر — جواب تلخ مت دے مجھکو اے شیریں دہن بس کر
جو لوہا جس نہ دی اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل — بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر
خال گورے منہ کا لیتا ہے مرے دل کو چرا — اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور

ولہ
گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبانِ چمن کیونکر — نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیونکر
کوئی محنت کوئی لذت اٹھاوے یار سے کوئی — کہو اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیونکر
تعجب سخت رہتا ہے یقیں اس بات کا مجھ کو — کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیونکر

ولہ
بعد مرنے کے ہوں ہیں گور میں غمناک ہنوز — گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز

ولہ
منہ پہ کھاتا ہے اسی طرح سے تلوار کہ بس — دل مرا عشق میں ایسا ہے جگردار کہ بس
نزع میں دیکھ کے مجھے یار جھجک کر بولا — کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس
آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا — کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس

ولہ
آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس — ورنہ ٹک پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس
تنگ تو کرتا ہے پر ہم جو کہیں جاتے رہیں — توڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

آج دیکھی ہی ہیں وہ لطف کی بیداد کہ بس
جی میں آتا ہے تری چھپ کو کر دکھا دیجے آسے
کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے
تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا
عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال
اہلِ نور آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت
بہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ
ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہی الفت کا چراغ
خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین
تا صبح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف
دل نہیں کھنچتا ہی بن تیرے بیاباں کی طرف
اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب
سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو یہ دیکھے یقیں
آئینہ ہوتا ہی اُس روئے درخشاں کا حریف
بہت جینے کی تدبیر اہل عرفاں کی نہیں لایق
رشک سے لاگے ہی پروانے کے جیسی تن کو آگ
جلتے بتوں سی کل ان نیلیا کپڑوں کے ساتھ
چمن میں مجھ سی دیوانے کو لیجانیکا کیا حاصل
جنہیں بالوں کی پھانسی دی ہو وی ہرگز نہیں جیتے
ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہی تو دارو ہے
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ ان دونوں دھاروں کے تئیں

ولہ — سر پہ آیا مرے اس طور سے جلاد کہ بس
باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس
آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس
ولہ — کس قدر پہلو ی چرب اپنے سی دکھ پاتی ہی شمع
دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہی شمع
ولہ — ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینہ کا داغ
ولہ — دیکھئے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ
ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ
ولہ — سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف
خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف
دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف
دل کھنچا جاتا ہے اُس زلفِ پریشاں کی طرف
ماہ بن اور کون ہو خورشید تاباں کی طرف
ولہ — کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کی نہیں لایق
ولہ — لگیوا ی فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ
جی دھڑکتا ہی مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ
ولہ — دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل
جو زلفوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا کیا حاصل
یہ سب کچھ سن کے ساقی بات پی جانے کا کیا حاصل
ولہ — خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے درگذر
بے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال

ولہ
ہاتھ لگتا گر زبانِ مصر کو یہ آفتاب
خواب ہو جاتا اُنہیں اُس ماہ کنعاں کا خیال

ولہ
مے ہوئی آخر رہی تدبیر غم کی ناتمام
کس سے دل خالی کریں اب ہم چکا ملنا تمام

ولہ
تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح مارا ہی جوش
ڈالتے ہیں جس طرح بدمست میخانے میں دھوم

ولہ
کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں
پڑیں ہیں میرے ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں

ہمیں بھی بات کہ آتی ہی لیکن دل نہیں حاضر
حیا سے دور ہی ناصح خموشی ساتھ تقریریں

یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے
نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں

ولہ
چمن میں شاخ ہل جاتی ہی جیسے گل کے ہلنے سے
لچک جاتا ہی دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں

ولہ
زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں
عشق پھیکا ہی اگر داغ نمک سود نہیں

ہے اُسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار
اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں

ولہ
کرتا ہی کوئی یارو اس وقت میں تدبیریں
مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

ناداں ہی جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے
لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں

چہرے سے نکل کر سو لپٹے ہیں یقیں منہ پر
اوراق طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

ولہ
کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں
عبث سینے ہو اُس کو کیا رہا ہی اب گریباں میں

چمن کر پیچ کلیانی ہے جیسے شاخ سنبل کی
ہوئی ہیں کس قدر دل جمع اُس زلف پریشاں میں

ولہ
بہار آئی ہی ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں
چمن میں باندھنے پاوینگے اب کے آشیاں دیکھیں

اُٹھا اس منہ سے اے باد صبا گھونگٹ کی آنچل کو
توجہ سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں

ولہ
نہ کر خجل مجھے مہماں مرا نہ ہوا اے عشق
کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں

ولہ
تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سوند کو نہیں
بس پہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں

سینہ میرے میں تری عشق سے جو شاں ہی عسل
کون ناسور ہے جو نیش کا معمور نہیں

دین و دنیا کی مجھے کام سے کھوتا ہے یقیں
چھوڑ دوں عشق نہ باللہ کہ مقدور نہیں

وله
خدا کی بندگی کہئے اُسے یا عشق معشوقی ۔ وہ نسبت ایک سے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں
سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے ۔ بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں
شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیں ۔ اب چھوڑدے نظارہ کچھ اس میں مزا نہیں

وله
وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں ۔ اُس آفتاب کا کس ذرّہ میں ظہور نہیں
ترے سفر کی خبر سُن کے جان دھڑکوں سے ۔ جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دُور نہیں
کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل ۔ یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

وله
جس محبت میں نہیں ہے شور ہے وہ بے نمک ۔ کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں
بن یقیں کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب ۔ سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

وله
شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں ۔ بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں

وله
اگر ستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے ۔ کہ اُس کا جی نکل جاتا ہے اُس کی ایک تنکن میں

وله
گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں ۔ کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں
ایسا دراز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا ۔ بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں
حق کو یقیں کے آخر برباد مت دو یارو ۔ تم نے سخن کی طرزیں اُس کی اُڑائیاں ہیں

وله
قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہے سرو ۔ دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو
تمہیں پامال یوں کرتے ہو اپنے خوش قامتو ۔ دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

وله
کھڑا ہے سرو نپٹ بن بنا کے رعنا ہو ۔ جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو
نہ لاتا تھا مرے گریہ کو شور پرائے عشق ۔ بُری بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

وله
خونِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو ۔ لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو
باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل ۔ اپنی بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو

وله
کوئی یہ چاند سا مُنہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا ۔ گذر آتش پرستی سے یہ پروانے سی کہہ دیجو

وله
ستاؤ مت یقیں کا دل کہ یہ خوباں کا مسکن ہے ۔ خدا جانے کہ کیا ہو اس کے مرجانے کو مت چھیڑو

جفا کے عذر میں اے ظالمو نہ دیر کرو — مری زباں پہ شکایت پہ مت دلیر کرو

جفا کی طرح میں اپنا بہل کیا ہے خوں — بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو

خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو — مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

ولہ

جو تو شراب پیے کیونکہ دل کباب نہ ہو — لگے جب آگ کہاں تک یہ زہرہ آب نہ ہو

خنک گذرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر — کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو

دیوانے شہر سے یہاں آکے جی چھپاتے ہیں — خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو

بتاں کی بیچ نہیں حُسنِ خلق و دامنِ پاک — وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو

یقیں بتاں کا ہوا جب سے بندہ تب سے ہی داغ — جو ہووے کافر اُسے کس طرح عذاب نہ ہو

ولہ

شہر میں تھا نہ ترے حُسن کا سا شور کبھو — مصر اس جنس سے اتنا نہ تھا معمور کبھو

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح — خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب — مجھ سے ملنا بھی سجن ہے تجھے منظور کبھو

اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو ای مرگ — تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

ولہ

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بیخوابی کے ساتھ — جمع آسایش کہاں ہوتی ہے بیگانے کے ساتھ

مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں — کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

ولہ

بہار آئی ہے کیا حکم ہے ای باغباں سچ کہہ — چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ

نمک ڈالا ہی مجھ میں اے ہما شورِ محبت نے — کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزے کی استخواں سچ کہہ

یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے — یہ کس بے درد سے سیکھا ہے فریاد و فغاں سچ کہہ

ولہ

کچھ عمر نہیں باقی پیارے تو شتاب آجا — ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہی پیمانہ

منہ اپنے کو گلشن میں رہنے نہ دیا گر تو — یہ سبزہ ترے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ

روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے — کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

ولہ

عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے — آ تو اے چرخ ٹک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

کہاں تاثیر نالوں میں ہے اے مرغ سحر چپ رہ
ولہ
عبث صیاد کو ناخوش ہے کیوں کر رہا بس چپ رہ

جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
ولہ
بندگی سے جس نے خو کی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں
دیکھیے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

کیا دل ہے اگر جلوہ گہِ یار نہ ہووے
ولہ
سے ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر
وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

دوانے کس طرح ناصح اُٹھاویں ہاتھ طفلاں سے
ولہ
کہ ہے کشتِ جنوں سیراب اُن کے سنگ باراں سے

یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
ولہ
کون اُس کوچہ میں جز تیر گذر کرتا ہے

اپنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس مُنہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میاں ہم سے
ولہ
ولیکن ہائے ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے
ولہ
کیا اے عشق مجھ کو ہائے ایسا ناتواں تو نے

خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجے رقیباں کو
ولہ
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اُس کا جی چاہے
ولہ
تو کرنے دو اُسے فریاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں کوئی کہ دشنام اُس کی ہم تک یاد دلا لاوے
ولہ
گیا ہے اب اُس کو دیکھیے کب تک خدا لاوے

پڑے پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بے کس
مرے فرہاد اور پرویز و شیریں کو اُٹھا لاوے

دیارِ حسن میں تو خوش ہوا پر یہ بڑی مشکل
کہ لٹ جاتا ہے وہاں جو کارواں حُسنِ وفا لاوے

مناسب نہیں ہے شکوہ جور کا ان خوب رویوں سے
یقیں کوئی بُری باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لاوے

زمیں پر جس طرح گرتا ہے سایہ سرو رعنا کا
ولہ
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی

نہیں ہوتے کبھو احباب کی خاطر ملول اُس سے
خدا نا آشنا عجب بد مصاحب ہے یہ تنہائی

معاوضہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
ولہ
کبھو کسو سے کوئی کیونکہ آشنا ہووے

اگر یہ خبر ہمیں یاد کر نہیں سکتا
یقیں ہوا مجھے قطرے سے اشک کے معلوم
خبر کیا پوچھئے مرغِ قفس سے آشیانے کی
گئے پڑ بھی شروع گلیں اور پرواز اول میں
موا جاتا ہوں مت اتنا بھی کس کر باندھ بالوں کو
زنجیر میں بالوں کے پھنس جانے کو کیا کہئے
دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا
دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیران تو سہی
مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے
کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں
کیا لگا لیتا ہے خوباں کو یقیں کرتی ہے داغ
جس کو منظور ہو جینا اُسے مرنا ہی عذاب
بے قراری کب ٹھہرنے دیتی مجھ کو زیرِ تیغ
ستم ہی قید کرنا اس طرح کے مرغِ ناداں کو
کرتے ہیں اپنے بال و کھا بتلا مجھے
جور و جفا میں یار بہت ہو گیا ولیسر
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے
قیامت آپ پر اُس قدسی لاچکے ہم تو
اس بسنتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے
نگاہ گرم سے کھاوے بھی تاب موتی طرح
یہ دل ملوک ہے خوباں کا کون اس کو چھپا رکھے

کبھو برا ہی ہمیں کہ ترا بھلا ہووے
نہ اٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے
ولہ اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی
نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں ہو میں مچانے کی
ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیریں دوانے کی
ولہ کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کیا کہئے
اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہئے
ولہ باغباں اب کے اجارے لوں گلستاں تو سہی
ولہ جی ہی نے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے
کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے
آئینہ کی ساوہ لوہی ساتھ پر کاری مجھے
ولہ ہے دمِ پاکِ مسیحا دمِ شمشیر مجھے
ولہ مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے
ولہ کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے
ولہ اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے
کرتے تو کی یہ راست نہ آئی وفا مجھے
ولہ یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے
کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے
ولہ جی میں ہے اک مصرعِ موزوں کو تضمیں کیجئے
خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے
ولہ بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبا رکھے

قلہ
حق مجھے باطل آشنا نہ کرے
میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
دوستی بد بلا ہے اس میں خدا
کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتول کافر نعمت
اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے
ناصحوں کی یہ کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

ولہ
حسن اور عشق ہیں اک طور کی نسبت سے ضرور
چشم بیمار تجھے دی ہے دلِ زار مجھے
یار آیا پہ مجھے ہوش نہ تھا کیا کیجے
نہ کیا اس دلِ دشمن نے خبردار مجھے

ولہ
چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے
وصیت ہے ہماری خوں بہا جلاد کو پہنچے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے اب نالہ کرتا ہوں
مری فریاد بھی شاید مری فریاد کو پہنچے
ہمیں اس غم کے ہاتوں زندگانی خوش نہیں آتی
کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہنچے

ولہ
ہوا میں سرد کی اتنا نہ کر شور و شر اے قمری
نہ دے برباد تو اپنی کفِ خاکستر اے قمری
یقیں رکھیو کہ شوخی خوب نہیں خدمت میں خوبی کی
تو بیجا سرو کے چڑھ بیٹھ بیٹھے سر پہ اے قمری

ولہ
گئے سب بھول شکوے دیکھ روئے یار کیا کہئے
زبان حرب سے میری ہوئے بیکار کیا کہئے
تبسم میں جو اُس کا منہ کھلا جی بندھ گیا اپنا
مرا دل لے گیا ہنستے ہی ہنستے یار کیا کہئے
اگر اُس کی جگہ پہلو میں ہوتا چار بہتر تھا
بہت دیتا ہے میرا دل مجھے آزار کیا کہئے
یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بدگماں بولا
یہ دیوانہ کچھ ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہئے

ولہ
دوانہ ہوں میں جی دینے میں مجنوں کے سلیقہ کا
مزے لے لے کے مرنے کی طرح فرہاد کیا جانے
گلا تو پھٹ گیا نے کیطرح فریاد کرنے سے
قیامت دور ہے کب تک ملے گی داد کیا جانے
نکل بھاگا ہے کوئی صید کیا اس دام سے سچ ہے
کئی دن ہیں کہ تیری زلف کی خاطر پریشانی

ولہ
اگر زنجیر میری پاؤں میں ڈالے تو کیا ہوگا
بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

ولہ
یہ وہ آنسو ہیں جن سے مہر آتشناک ہو جاوے
اگر ہوئے کوئی یہ آب جل کر خاک ہو جاوے
گنہگاروں کو ہے اُمید اس اشکِ ندامت سے
کہ دامن شاید اس آبِ رواں سے پاک ہو جاوے

عجب کیا ہی تری خشکی کی شامت سے جو تو زاہد
نہال تاک ٹپلاوے تو وہ مسواک ہو جاوے

ولہ
اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے
مزا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے سجن خاک میں ملانے کا
کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

یہ قیس کا شور جنوں سن کے یار نے پوچھا
کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

ولہ
خوش آئی ہی مجھ کو یہ بات اُس مجنونِ عریاں سے
کیا کیجے کہاں تک چاک گذری ہم گریباں سے

ولہ
نہیں ہی جام مے بن کچھ ہمارا خونبہا ساقی
اس آبِ زندگی سی اپنی یاروں کو جلا ساقی

تک اک تو رحم کر اے مرگ می کی تمنا میں
ہماری جان کو روتی ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

ولہ
وفا کا کیا قیامت ہے کوئی بدلا جفا دیوے
ترحم ان بتوں کو اپنی بندوں پر خدا دیوے

ولہ
نہیں پرواز قسمت میں میری اُڑا
خفا ہو زندگی سی مر گیا ہوں لیک ڈرتا ہوں

مبادا حشر مجھ کو خوابِ راحت سے جگا دیوے

ولہ
محبت کا جو ناتا ہی عجب آداب ہیں اُس کے
کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے

ولہ
نہ دے فرصت ان ہاتھوں سے کہ کچھ کام اُدھر بھی نکلے
ہم آخر ہوں گے دامنگیر اس چاکِ گریباں کے

ولہ
رگڑتا ہے سر اپنا پشت پا پر متصل تیرے
گریباں پھاڑئیے اس پر کہ کیا طالع ہیں داماں کے

ولہ
تک اک انصاف کر کرتا ہی اتنی بھی جفا کوئی
لکھو صندل کھینچ ماتھے پر کیا ہے قتل عام

ولہ
تیغ ابرو کو دیا ہی سنگ دیکھا چاہیئے

۲- یکرنگ

یکرنگ تخلص، مصطفیٰ قلی خاں نام، متوطن شاہجہان آباد کے۔ نواسوں میں خانجہان خاں لودی کے، اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے منصبداروں میں محمد شاہ بادشاہ، اور شہرۂ آفاق ساتھ عزت و جاہ کے، مشہور سخنوروں میں شاہجہاں آباد کے، اور معروف زباں آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے۔ طور انکی گویائی کا پیرو قدما کی گفتگو کے ہے، اور طرز ان کے کلام کی روِیہ پر مضمون و آبرو کی ہے، لیکن ازبسکہ شیوہ سابق یاران حال کے غیر مرغوب ہے، تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے۔ بلدہ شاہجہان آباد میں انہوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا اور دلوں پر احباب کے داغ حرماں کا دیا۔ یہ اشعار پُر معنی و خوش بیان ان کے منتخب دیوان ہیں۔

مجھے مت پوچھ پیارے اپنا دشمن	وله	کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا
میں روز و شب وصال سے تیری ہوں کامیاب	وله	کیونکر کہوں کہ تجھ سی بہتر ہے آفتاب
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے	وله	راستے ہیں گے دار کی صورت
مجھ کو معلوم یوں ہوا گل سے	وله	پھول جاتے ہیں اُس سے دولتمند
کیوں کہے ہو تم کہو دشمن ہمارے اس قدر	وله	دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہے پیارے اس قدر
نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس	وله	تری آنکھوں سے کیونکر دل جدا ہو
روٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں	وله	تا گلے تیرے لگوں اے یار میں
اُس پری پیکر کو مت انسان بوجھ	وله	شک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بوجھ
کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب	وله	ہم تو ترے فراق میں اے یار مر چلے
رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے	وله	کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے
بے قراروں کے تئیں آرام دل		اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ	وله	مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
ہوا معلوم یہ غنچہ سے ہم کو	وله	جو کوئی زردار ہے سو تنگ دل ہے

نہیں چھوڑیں ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ	وله	باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے
اب تو سجن ہمیں کو نباہی تمہیں سے ہے	وله	ہم سب طرف سوں یار تمہارے گلے پڑے
یک رنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط	وله	رکھتا ہے یہ دو نین کہو تو نظر کرے
زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا	وله	گلزار کی نمط سے ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ		دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا
اندھیرے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ		ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

بعون اللہ تعالیٰ کتاب تذکرۃ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف تخلص بتاریخ بست و ششم ماہ ربیع الثانی ۱۲۳۵ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گذشتہ بہ اتمام رسید

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائے گا۔